ماہنامہ

# فکرِ نو

علی گڑھ

جولائی ۲۰۱۹ء

مدیر

ریاض الرحمٰن شروانی

ماہنامہ

# فکرِ نو

علی گڑھ


سال دوم | جولائی ۲۰۱۹ء | شمارہ نمبر (۱۲)


مدیر

## ریاض الرحمٰن شروانی




قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے | قیمت سالانہ: ۱۵۰ روپے



ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ:

**Dr. Madihur Rahman Sherwani**

Habib Manzil, Marris Road, Aligarh-202002 (U.P.)

fikrenaualigarh@gmail.com



براؤن بکس، علی گڑھ

# فہرست



***

ادار یہ

# الیکشن کے بعد

فکرِ نو کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس طرح اس کا مذہب اور ادب سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں۔ البتہ ان تینوں چیزوں کے ثمرات اور نتائج سے اس کا تعلق ہے۔

اپریل اور مئی میں جو پارلیمانی انتخابات ہوئے ان کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ البتہ ان کے بعد جو صورتِ حال رونما ہوئی ہے اس کے بارے میں ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

وزیر اعظم نریندر مودی نے بیان دیا کہ جن لوگوں نے ان کی پارٹی کو ووٹ نہیں دیئے ان کے دل جیتنے ہیں۔ ان لوگوں میں اکثریت بھی آتی ہے اور اقلیتیں بھی۔ ان کا بیان واضح نہیں ہے کہ انھیں دل صرف اکثریت کے جیتنے ہیں یا اقلیتوں کے بھی۔ تاہم صرف 'لوگ' کہنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اکثریت اور اقلیتیں سب شامل ہیں۔ لیکن دل جیتنے کا طریقہ کیا ہوگا، یہ واضح ہونا ضروری ہے۔ ہمایوں کو اس کے والد نے لکھا تھا کہ: ''اس ملک پر دل جیت کر حکومت کی جاسکتی ہے۔ دل توڑ کر نہیں''۔

اس کا مطلب ہے سب کے ساتھ خوشگوار اور مساویانہ سلوک! لیکن ہمارے یہاں اس بیان کے بعد چند ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو ہماری امیدیں خاک میں ملا دیتے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: عبدالوحید۔ تمہارا مذہب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: اسلام! پھر تمہارا یہاں کیا کام، تم پاکستان جاؤ۔ جیب سے پستول نکالا اور اس پر حملہ کردیا۔ ایک صاحب جو اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے اس فعل کی مذمت کی اور کہا کہ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ مذہب کیا اختیار کیا جائے، یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ تو وہاں بیٹھا ہوا مجمع ان صاحب پر بپھر اٹھا اور کہا کہ آپ کے اس طرح کے اقوال سے ہماری پارٹی کی بدنامی ہوتی ہے اور ہماری ریاست (ہریانہ) میں جو صوبہ جاتی انتخابات ہونے والے ہیں، ان پر ہمیں نقصان پہنچے گا۔ قاتل گرفتار کرلیا گیا، لیکن دوسرے ہی دن ضمانت پر رہا ہوگیا۔ اس کے رہا ہونے کی خوشی میں اس کے ہم خیال لوگوں نے اسے ہار پہنائے اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔ یہ طریقہ دل جیتنے کا نہیں ہے بلکہ اور دوری پیدا کرنے کا ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ ایسے فعل کی ہر طرح سے مذمت ہو اور ایسے لوگوں کو قرار واقعی سزا ملے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، دوری برقرار رہے گی، ملک کی ہر چہار طرف بدنامی ہوگی اور باہمی رشتے جڑنے کے بجائے ٹوٹیں گے۔ جو لوگ ایک ملک میں رہتے ہیں

ہمارے آئین کے مطابق ان سب کے حقوق اور ذمہ داریاں مساوی ہیں اور ان سب کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہئے۔ طاقت ور کو کمزور پر فوقیت نہیں حاصل ہونی چاہئے۔ یہ کمزور اقلیتیں بھی ہوسکتی ہیں، دلت بھی ہوسکتے ہیں، عورتیں اور بچے بھی، قبائلی بھی۔

فکرِ نو کے اس شمارے میں پروفیسر ظفر الاسلام کا ایک مضمون ہم شائع کر رہے ہیں جس کا عنوان ہے ''حسنِ اخلاق''۔ یہ ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔ اسلام دلوں کے جوڑنے کے لئے آیا ہے، توڑنے کے لئے نہیں۔ مولانا آزاد نے لکھا تھا ''آزادی کا حصول اوروں کے لئے صرف ملکی مسئلہ ہے، مسلمانوں کے لئے دینی فریضہ بھی ہے''۔ اسی طرح ملک میں امن وامان قائم رکھنا مسلمانوں کی صرف وطنی نہیں بلکہ دینی ذمہ داری بھی ہے۔ ہمیں اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جو باہمی رشتوں میں دراڑ ڈالے؛ بلکہ ایسے کام کرنا چاہئیں جن سے ہم اپنے ہم وطنوں کے قریب آئیں۔ اور ان کی نیت کی کھوٹ کو حتی الامکان دور کریں۔ یہ کہہ دینا آسان ہے، مگر اس پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب ہمیں کوئی ذاتی نقصان پہنچتا ہے تو ہم قدرتی طور پر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے ہیں، لیکن حالات کو بہتر بنانے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ اکثریت اور اقلیت دونوں کے ساتھ رحیم اور شریف النفس لوگ جذبات کو قابو میں رکھ کر ان باتوں پر عمل کریں۔ جو سیاسی جماعتیں سیکولرزم کا دعویٰ کرتی ہیں انھیں واقعی اپنے کو سیکولر ثابت کرنا چاہئے، ورنہ نقصان صرف کسی ایک فرقہ یا ذات کا نہیں ہوگا بلکہ پورے ملک کا ہوگا۔ ہمیں کسی جماعت یا چند اشخاص سے شکایت ہوسکتی ہے لیکن ملک جس طرح ان کا ہے اسی طرح ہمارا بھی ہے اور اس کی بقا اور ترقی ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

حصولِ آزادی کے چند روز کے بعد ایک صاحب پاکستان سے ہندوستان آئے اور مولانا آزاد سے ملے۔ مولانا نے ان سے پاکستان کا حال پوچھا۔ انھوں نے، یہ سوچ کر کہ مولانا اس سے خوش ہوں گے، پاکستان کی ایسی تصویر پیش کی جو بہت ہی ہولناک تھی اور جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کی بہت بری حالت ہے۔ مولانا نے ان سے کہا ''تو پھر اس کو بہتر بنانے کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں، ہم تقسیمِ ملک کے مخالف تھے، کیونکہ ہمارا خیال تھا اُس سے نقصان پہنچے گا، جو پہنچا، لیکن اب اگر پاکستان ٹوٹتا ہے یا بکھرتا ہے تو اُس سے زیادہ نقصان پہنچے گا، لہٰذا اسے قائم رہنا چاہیے اور مضبوط ہونا چاہیے''۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ ان کی توقع کے خلاف مولانا کو ان کے بیان پر تعجب اور افسوس ہوا تھا۔ یہی رویہ ہمارا بھی ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ فلاں جماعت برسرِ اقتدار آگئی ہے تو ملک کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے! ملک کی حالت خراب ہونے سے نقصان صرف اس جماعت کا نہیں ہوگا بلکہ ہم سب کا ہوگا۔

اس لئے ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ حکومت جس کی بھی ہو، حالات بہتر سے بہتر ہوں۔ دوسری طرف وزیر اعظم کے قول کے مطابق سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ

ہونا چاہئے اور سب لوگوں کے دل جیتنے چاہئے تا کہ ملک کی بہتری اور ترقی میں خلل نہ پڑے اور حالات روز بروز بہتر سے بہتر ہوتے جائیں۔ ملک کی حالت خراب نہ ہو، اس کے لئے سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت اور اکثریتی فرقے کی ہے، لیکن بری الذمہ اقلیتیں بھی نہیں ہیں، جس طرح کے واقعہ کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ایسے واقعات ملک کی تصویر بگاڑتے ہیں، بناتے نہیں ہیں۔

اس لئے ہر ایک کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے، مسلمانوں کو اس لئے بھی کہ ان کا ذاتی فائدہ اس میں ہے۔ اگر ملک کو نقصان پہنچے گا تو اس سے ہم بھی محفوظ نہیں رہیں گے بلکہ سب سے زیادہ نقصان ہمیں ہی پہنچے گا۔ اور، جیسا کہ ہم نے کہا ملک میں امن وامان قائم رکھنا مسلمانوں کی صرف وطنی نہیں بلکہ دینی ذمہ داری بھی ہے۔

ریاض الرحمٰن شروانی

# رشید احمد صدیقی کا مضمون "سیدین علی گڑھ میں"

پیشکش: پروفیسر اصغر عباس

ابھی تک جن فاضل محققین اور مرتبین نے رشید احمد صدیقی کی ساری تحریروں کو یکجا کرکے شائع کیا ھے ان میں رشید صاحب کا مضمون "سیدین علی گڑھ میں" شامل نھیں ھے۔

مذکورہ مضمون مجھے رام پور رضا لائبریری کے فرض شناس ڈائریکٹر پروفیسر سید حسن عباس کے توسط سے حاصل ھوا ھے، میں ان کا صمیم قلب سے شکر گزار ھوں۔ یہ مضمون "ارمغان الفت" سے اخذ کیا گیا ھے، جسے مجلس نذر سیدین کی جانب سے راشٹر پتی بھون کی ایک تقریب میں صدر جمھوریہ ھند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے خواجہ غلام السیدین کو پیش کیا تھا، سیدین صاحب کا تعارف مجلس کے صدر اور نائب صدر جمھوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کرایا تھا۔

ارمغان الفت کو پیش کرنے والوں کی مجلس میں اس وقت کے اھم ترین اشخاص شامل تھے۔

ارمغان الفت کے دو حصے ھیں، ایک انگریزی مضمون لکھنے والوں کا، اور دوسرا اردو میں مضمون لکھنے والوں کا۔ ارمغان الفت کے مرتبین ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر عبد الرشید ھیں۔ اردو میں ارمغان علمی کی روایت کا آغاز غالباً ارمغان الفت ھی سے ھوتا ھے۔

خواجہ غلام السیدین کا تعلق خانوادۂ حالی سے ھے، علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے، یھاں کے طالب علم ھونے کے علاوہ وہ ٹریننگ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۸ء تک پرنسپل رھے تھے۔

اب، رشید صاحب کا وہ مضمون ملاحظہ ھو جو ھنوز کتابوں کی ایک گپھا میں چھپا بیٹھا تھا۔ (اصغر عباس)

O

جتنے زیادہ دن گزرے ہوں اتنے ہی ان کے کم ہونے کا احساس ہوتا ہے، معلوم نہیں یہ بڑھاپے کا خاصہ ہے یا بعض حالات و واقعات میں ایسی کوئی بات ہوتی ہے۔ یاد نہیں آتے تو نہیں آتے، ع مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں۔

یہ زمانہ سیدین صاحب کی طفولیت کا تھا جب وہ اپنے اسکول، اسلامیہ ہائی اسکول پانی پت، کی طرف سے تقریری مقابلہ میں شرکت کے لئے ایم۔اے۔او۔ کالج علی گڑھ آئے تھے۔ یہ تقریب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوئی تھی۔ اسٹریچی ہال میں تعلیم یافتہ ہندو مسلمان شرفا، اکابر اساتذہ اور طلبا کا شاندار اجتماع، اسکول کے ایک کمسن طالب علم کا اس موقع پر تقریر کرنے کے لئے اس اعتماد کے ساتھ مجمع کے سامنے آنا جیسے اسٹریچی ہال میں نہ صرف یہ کہ اس فن کا کوئی آشنا موجود نہ ہو بلکہ اپنے محلّہ اور مکتب کے ہم عمر ساتھی ہوں، وہ بھی بیشتر ایسے جو ذہنی اعتبار سے فروتر ہوں! لیکن یہ قصہ تو کہیں اور بیان کر آیا ہوں۔

جلسہ ختم ہوگیا لیکن تقریر اور مقرر کا چرچا کچھ دنوں کالج میں ہوتا رہا۔ اس عہد کے کالج کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یاد نہیں آتا سیدین صاحب کس سال ہائی اسکول کا امتحان پاس کرکے پانی پت سے علی گڑھ آئے، شاید اسی سال یا کچھ آگے پیچھے جب ایم۔اے۔او۔ کالج مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہوا، غیر معمولی امتیاز سے بی۔اے۔ پاس کیا۔ مجلس اتحاد (یونیورسٹی یونین کلب) میں تقریر کرنے کے جتنے چھوٹے بڑے انعامات تھے وہ سب حاصل کئے۔ حالانکہ اس زمانے میں کالج میں ایک سے ایک اچھی تقریر کرنے والے موجود تھے۔ ان کے مقابلے میں اپنی تقریر نیز تحریر کا لوہا منوانا معمولی بات نہ تھی۔

دوسری خوبیوں کے علاوہ تقریر و تحریر کی غیر معمولی استعداد سیدین صاحب کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد ماجد خواجہ غلام الثقلین اور عم محترم خواجہ غلام الحسنین اپنے عہد کے مشہور مقرر و مصلح تھے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کالج یونین کے ممتاز عہدہ دار اور ارا کین میں سے تھے۔ ''جریدۂ عالم'' پر باپ بیٹے کا دوام ''ثبت'' ہوا نہیں کالج اور یونین کے جریدے پر ثبت ہو چکا ہے۔

علی گڑھ تحریک کا ایک اہم پروگرام اصلاح رسوم و معاشرت کا تھا لیکن تعلیمی اور سیاسی مسائل کے نت نئے حالات و حوادث نے سرسید اور ان کے رفقاء کی توجہ کو اس حد تک اپنی طرف مائل رکھا کہ اصلاح کا پروگرام التوا میں پڑ گیا، اس فروگزاشت کی تلافی خواجہ غلام الثقلین مرحوم تمام عمر یکۂ و تنہا مسلسل گراں بہا خدمات سے کرتے رہے۔ اصلاح کا کام دیر میں اور تھکا دینے والے انتظار کے بعد برگ و بار لاتا ہے، اس میں چمک دمک نہیں ہوتی۔ امتیاز و اقتدار سے کلیتہً بے نیاز رہ کر خلوص و تندہی سے کام نہ کرتا رہے تو مقصد برآری نہیں ہوتی۔ اسی لئے بہت کم لوگ اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت کرتے ہیں۔

یہ فریضہ اسی یکسوئی سے انجام پاتا جس سے علی گڑھ تحریک کے دوسرے کام، تو بہت سی وہ خرابیاں یا مشکلات

از خود دور ہو جاتیں جن کے لئے سرسید، ان کے رفقائے کرام اور بعد کے آنے والے کارکنوں کو غیر معمولی دشواریاں پیش آئیں؛ کہیں کہیں رسوائیاں بھی۔ اصلاح رسوم و معاشرت کے پروگرام کو نظر انداز کر دینے یا ثانوی حیثیت دے دینے سے تعلیم، تربیت، مذہب، سیاست میں وہ توازن یا توافق نہ آسکا، جس کی کمی اب تک محسوس کی جارہی ہے۔

آج بھی جبکہ ہر طرف آزادی و بیداری کے آثار نظر آرہے ہیں عامۃ الناس کے افکار و اعمال کی اصلاح اور ان کی عام زبوں حالی کو بہتر بنانے کے بجائے ہم ان کو اپنے مشتبہ مقاصد یا مفاسد کا آلہ کار بنانے کی طرف مایل ہیں، ہمارے اس خیال کو اب عوام سمجھ چکے ہیں، چنانچہ انہوں نے ہم کو اپنے مقاصد کا آلہ کار بنانا شروع کر دیا ہے۔ عوام اور لیڈر دونوں ان دنوں ایک چکر میں اسیر بے تحاشا ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔

یہاں یہ گفتگو بظاہر دور از کار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کو سمجھے بغیر خواجہ غلام الثقلین کی خدمات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ سیدین صاحب نے تعلیم و تربیت کے مسئلہ و مہم کو اپنا کر جوان کی صلاحیتوں کے عین مطابق تھا اپنے والد محترم کے مشن کو آگے بڑھایا۔

خواجہ غلام الثقلین حالی کے نواسے اور ان کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین کے داماد تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ سرسید کو حالی نہ ملے ہوتے تو ان کے کارناموں میں وسعت نہیں تو وہ برکت بھی آتی یا نہیں جس نے علی گڑھ تحریک کو ایک طور پر Renaissance (نشاۃ الثانیہ) اور Reformation (تحریک اصلاح مذہب) کی حیثیت دے دی۔ سرسید کے کاموں کو حالی سے براہ راست یا بالواسطہ، قریب یا دور کا جو فائدہ پہنچا اس کے مرتب و منظم مطالعہ کی طرف اب تک ہماری توجہ کم گئی ہے۔ سرسید کی بے بہا اور بے مثل خدمات میں جس مخصوص ضمیر کی روشنی ملتی ہے اس میں حالی کا تصرف نمایاں ہے۔

سیدین صاحب، خواجہ غلام الثقلین کے فرزند اور حالی کے پڑپوتے اور پڑنواسے ہیں، وہ ان دونوں کی اعلی ذہنی علمی اور اخلاقی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہیں۔ حالی کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف مجھے کبھی نہیں حاصل ہوا، لیکن ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب سے ہوا ہے، جب وہ بہت ضعیف اور تقریبا گوشہ گزیں ہو چکے تھے۔ خواجہ صاحب کی شفقت و شرافت کو دیکھتے ہوئے اندازہ کر سکتا ہوں کہ حالی کی بلندی و بزرگی کا کیا عالم رہا ہوگا۔ اسی طرح خواجہ غلام الثقلین صاحب کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن ان کے فرزند کے شریفانہ اخلاق و عادات نیز اکتسابات علمیہ و ذہن کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی شخصیت کس پائے کی رہی ہوگی۔

سیدین صاحب نے علی گڑھ میں طالب علمی کا پورا زمانہ بورڈنگ ہاؤس میں گزارا، عام طور پر کسی کو علی گڑھ کا مکمل تعلیم یافتہ نہیں سمجھا جاتا تاوقتیکہ اس نے اپنی تعلیم و تربیت کا کافی زمانہ یہاں کے ہوسٹل میں بسر نہ کیا ہو۔ اس عہد کا دستور تھا کہ جو طالب علم علم و فن کی کسی شاخ میں ممتاز ہوتا اس کے ارد گرد ہم خیالوں کا حلقہ قائم ہو جاتا جسے آج

کل کی اصطلاح میں اسٹڈی سرکل یا کلچرل گروپ کہتے ہیں۔ آج یہ بات غیر معمولی نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ ملک میں شعر و ادب نیز دوسری کلچرل سرگرمیوں کو ترقی دینے کے لئے طرح طرح کے ادارے قائم ہیں، اور ہوتے جارہے ہیں، لیکن اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے اقامتی زندگی کا بڑا جامع اور نتائج کے اعتبار سے نہایت صحت مند، کثیر المقاصد پروگرام علی گڑھ میں بطور خود نافذ تھا، جس کی مثال سارے ملک میں نہ تھی۔

اس عہد میں اس طرح کے علمی و ادبی حلقے طلبا میں اتحاد خیال واتحاد جذبات، علم وفن سے شغف، پاس مراتب، وسیع المشربی اور خیر منشی کی استعداد پیدا کرنے میں بہت معین ہوتے تھے۔ علی گڑھ کے طلبا میں ایک دوسرے کا جو غیر معمولی پاس ولحاظ ملتا ہے، اور خود علی گڑھ سے تا زندگی ان کو جو شیفتگی رہتی ہے وہ بہت بڑی حد تک اسی طرح کے حلقہ ارباب صفا کا فیضان ہے، ایسے متعدد و متنوع حلقوں سے کسی نہ کسی سے تقریبا ہر طالب علم اپنے مذاق و استعداد کے اعتبار سے وابستہ ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم میں ہر شخص سب سے بڑے حلقہ یعنی علی گڑھ کا حلقہ بگوش ہو جاتا۔ یہاں ایک شعر یاد آتا ہے۔ اور جس طرح یاد آیا ہے، اس سے یقین ہوتا ہے کہ اچھا اور برمحل ہوگا:

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

سیدین صاحب جس گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور جن روایتوں سے انہوں نے پیمان وفا باندھا تھا وہ علی گڑھ میں اور زیادہ منقح و مستحکم ہوگئیں، اس لئے کہ یہاں کے آب وگل کا خمیر اسی طرح کی روایتوں سے اٹھا تھا۔ ان کی تخلیق وتزئین میں اس عہد کے بزرگوں کا بڑا قیمتی حصہ تھا۔ ایسے ہی ایک حلقہ علم و ادب کے گل سرسبد سیدین صاحب تھے۔ اس حلقے کے اراکین آج بھی اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے معروف وممتاز ہیں۔ اس طرح علم وفن کا احترام سیدین صاحب کی زندگی کا ایک جز بن گیا، چنانچہ کالج سے نکلنے کے بعد وہ جس منصب پر فائز ہوئے اور ذوق وذہن کے اعتبار سے کیسی ہی ''وادی غیر ذی زرع'' سے کیوں نہ سابقہ رہا ہو، ذوق وذہن کی شمع روشن کرتے رہے۔

سیدین صاحب نے اپنی تعلیم علی گڑھ میں مکمل کی۔ پھر ولایت گئے، وہاں سے ایم۔ ایڈ ہوکر آئے اور مادر درسگاہ کے شعبہ تعلیمات سے منسلک ہوگئے، یہیں پروفیسر ہوئے۔ پرنسپل کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد بمبئی، کشمیر، دہلی میں تعلیم کے اعلیٰ صیغوں کے انچارج رہے، آزادی سے پہلے اور اس کے بعد نظام تعلیم کی اصلاح اور تشکیل نو کی جتنی تحریکیں بروئے کار آئیں کم و بیش سب میں کسی نہ کسی حیثیت سے ان کی غیر معمولی قابلیت اور تجربے سے فائدہ اٹھایا گیا جس کی تفصیل اس جلد کے اوراق میں نظر سے گزرے گی۔

اس وقت وہ زمانہ یاد آتا ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم مرکز میں وزیر تعلیم تھے اور کتنے اور کیسے کیسے جوہر قابل اپنے گرد اکٹھا کر لئے تھے: سیدین صاحب، سید اشفاق حسین، پروفیسر ہمایوں کبیر اور بعض دوسرے اصحاب۔ مرکزی کابینہ کے دوسرے صیغوں کا نہ مجھے کوئی

علم، نہ ان سے کوئی دلچسپی، وزارت تعلیم کے بارے میں البتہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نے بالغ نظری، رواداری اور کارکردگی کی ایک قابل قدر روایت قائم کر دی تھی۔ اچھی روایت کے بغیر کسی ادارے کی ساکھ نہیں قائم ہوتی، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ نقشہ تادیر قائم نہ رہ سکا۔ وجوہ سے بحث نہیں۔

وزارت تعلیم سے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد انھوں نے امریکہ کے بعض موقر علمی و تعلیمی اداروں میں مدعو پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم کے مختلف مسائل پر خطبے دئے۔ ان دنوں یہ سلسلہ جزائر ہوائی میں جاری ہے۔ سیدین صاحب کے تعلیمی خطبات تحریر و تقریر اور ان کی تصانیف عالمانہ، سلجھی ہوئی اور حشو وزوائد سے پاک ہوتی ہیں۔ سال کی بہترین تصنیف ہونے کے اعتبار سے ان کے اردو مجموعۂ مضامین ''آندھی میں چراغ'' پر ساہتیہ اکیڈمی نے اپنا سب سے بڑا انعام دیا ہے۔ منتخب شرفائے ادب اور ارباب فضل و ہنر کی محفل میں بحث و بصیرت کے اعتبار سے سیدین ہمیشہ اہل محفل کے ہمدوش و ہم عناں رہے۔ وہ موجودہ زمانے کے نو بہ نو تقاضوں سے پورے طور پر آشنا ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر ہماری مانی ہوئی قدروں سے ہم آہنگ نہیں ہیں لیکن ان تقاضوں کے ناسازگار ہونے کو ناگزیر یا ناقابل تسخیر نہیں سمجھتے اور ان کی آڑ میں خوب کو زشت کا رنگ دینے کی کوشش نہیں کرتے جیسا کہ آج کل کے کم سواد مدعیان فکر و فن کرتے ہیں۔

سیدین صاحب کا تعلق تمام عمر اعلیٰ علمی و تعلیمی سرگرمیوں سے رہا۔ یہ ان کے رجحان طبع، خاندانی روایات، ممتاز علمی و تہذیبی شخصیتوں کی رفاقت اور اس پاکیزہ اور صحت مند ماحول کا نتیجہ ہے جو اول سے آخر تک ان کو میسر رہا اور اب تک ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ سیدین صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف کیا ہے تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اقدار اعلیٰ کی ہمہ وقت، ہمہ جہت تبلیغ! غالباً ان کی سب سے پہلی مستقل تصنیف Iqbal's Philosophy of Education ہے جو آج سے کم و بیش پچیس سال پہلے شائع ہوئی جس میں انہوں نے اقبال کے کلام سے ان کے تعلیمی نقطہ نظر کی تعبیر و توضیح کی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ان کی ایک اور کتاب Man in the New World شائع ہوئی جو شعبہ جنرل ایجوکیشن علی گڑھ یونیورسٹی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ دونوں کی تصنیف و اشاعت میں کافی بُعدِ زمانی ہے لیکن مصنف کے فکر و نظر کی محنت و اساس میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئے گی۔ حالانکہ سیدین صاحب نہ کبھی آئین نو سے ڈرے نہ طرز کہن پر اڑے۔

اقدار اعلیٰ کا سرچشمہ مذہب و اخلاق ہے۔ انسانیت کا صالح تصور مذہب و اخلاق کی دین ہے۔ جب انسانیت ہر طرف سے راندہ و درماندہ ہوتی ہے تو مذہب و اخلاق ہی کی روشنی و رہنمائی میں خیر کثیر سے ہمکنار ہوتی ہے۔ سیدین صاحب اقدار اعلیٰ کے حامی ہیں، اس کی وجہ سے میرے دل میں ان کی بڑی وقعت ہے۔ اقدار اعلیٰ کیا ہیں اور کیا نہیں اس سے یہاں بحث نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ اقدار اگر اعلیٰ ہیں تو وہ اقدار مطلق بھی ہیں، سیدین صاحب کی تحریر و تقریر میں زندگی

اور معاشرے کا انسانی تصور ملتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ علم خواہ کسی نوعیت کا ہو، کتنا ہی ترقی کر چکا ہو یا کرنے والا ہو، اس کو لازمی طور پر انسان وانسانیت کی چاکری میں رہنا پڑے گا، نہ یہ کہ انسان علم کا غلام بن جائے۔ آج ہم طرح طرح کی جن آفتوں میں مبتلا ہیں اس میں غریب علم ملزم یا مجرم نہیں صرف مستغیث اور داد خواہ ہے اور 'شدم زصحبت آدمیاں خراب' کا مصداق! علم، تعلیم اور معلم میں اخلاقی رشتہ ہے نہ کہ میکانیکی یا حیاتیاتی۔ سیدین صاحب نے ہمیشہ اسی کی تائید کی ہے، اس لئے وہ ہماری تہنیت وتشکر کے مستحق ہیں۔

سیدین صاحب کو اسلاف سے، اپنے خاندان سے، اپنی درسگاہ سے، اپنے ساتھیوں سے، اپنے مطالعہ اور تجربے سے ایسا انداز فکر وعمل ملا ہے، کہ ناسازگار حالتوں میں خاص طور پر وہ زندگی کے اعلیٰ معیار پر قائم رہنے کو اپنا سب سے بڑا اور اہم فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کے بارے میں اور بہت سی اچھی باتیں کہنے سے رہی جاتی ہیں، مجلّے کی گنجائش محدود ہے، یہ بھی گوارا نہیں کہ اچھی باتیں رواروی میں کہہ ڈالی جائیں۔ البتہ اس کا اطمینان ہے کہ اچھی باتوں نے اپنے اظہار واعلان کے لئے سیدین صاحب کا انتخاب کیا، اور سیدین صاحب کا انتخاب ان سب نے، جن کے نام آپ کو اس خوبصورت اور یادگار کتاب کے اوراق میں ملیں گے۔

☆☆☆

# ایک اہم ادبی منشور

(سرور صاحب کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام ڈاکٹر محمد حسن)

پروفیسر آل احمد سرور

(الف) میرے خیالات میں تضاد نہیں ہے۔ ارتقا ضرور ہے، اور ہر ارتقا ظاہر کرتا ہے کہ ذہن بیدار ہے، اور ہر تجربے کو بشرطیکہ معنی خیز ہو، ہمدردی سے دیکھتا ہے، لیکن محض نئے پن یا سنسنی خیزی کا قائل نہیں ہے۔

(ب) ادب میں ادب کے بنیادی تقاضوں، اس کے مخصوص اظہار، اس کی معنویت پر اصرار ضروری ہے۔

(ج) سرسید کی تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک یا کوئی اور تحریک اس میں 'طرفداری' کے بجائے 'سخن فہمی' پر اصرار [ہو]۔

(د) زندگی میں تبدیلیوں اور اس کے نتیجے کے طور پر ادب میں بھی تبدیلیوں اور اظہار اور فارم کے سانچوں میں بھی تبدیلی کو فطری سمجھنا، گو صحت مند روایت اور اس کے تعلق پر اصرار کرنا۔

(ہ) ترقی پسند تحریک کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر نظر رکھنا۔

(و) سیاست کو وسیع معنی میں لینا اور حقیقی سیاست پر اصرار کرتے ہوئے سیاسی پروگراموں یا سیاسی وابستگیوں کے ادب کی نوعیت کو سمجھنا یا سمجھانا۔

(ز) ہر قسم کی گروہ بندی یا جتھے بندی سے احتراز کرنا اور اپنی بات برابر دھیمے اور نرم لہجے میں لیکن صاف طور پر کہنا۔

(ح) نئی نسل کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور جو خلیج اس وقت پیدا ہو گئی ہے، اسے پاٹنے کی کوشش کرنا۔

(ط) ہر دور میں کسی میلان کے زیر اثر اچھے اور برے نمونے سامنے آتے ہیں، برے نمونوں کی وجہ سے اچھے نمونوں کی اہمیت سے انکار کر دینا ادبی دیانت کے خلاف ہے، ہاں برے کو برا ضرور کہنا چاہیے۔

(ی) روس اور امریکہ دونوں سے دوستی کے جذبات رکھتے ہوئے، روسی اور امریکی دونوں قسم کے ایکٹ سے علیٰحدگی، اور قومی وقار اور قومی نقطۂ نظر پر اصرار۔

(ک) ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین میں فرق کرنا، اول الذکر کی ادبی اہمیت مسلّم ہے اور اس کا رول ہمارے ادب میں نہایت اہم رہا ہے، اور اس کی قدر کرنا چاہیے، گو آج اس نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ انجمن کا ریکارڈ نہایت مایوس کن رہا ہے، اس کی بے

عملی، طویل خاموشی، اور موجودہ ہیئتِ ترکیبی کی وجہ سے اس سے کوئی امید قائم کرنا میرے نزدیک غلط ہوگا۔

یہ ایک ادبی اور معروضی تجزیہ ہے اس میں دوستی اور دشمنی کا کوئی سوال نہیں ہے۔

مجھے نہ لیڈری کا شوق ہے نہ سیاست کا، میں ادب کا طالب علم ہوں اور مجھے نہ کوئی دکان چلانی ہے، نہ کوئی محاذ قائم کرنا ہے، ہاں آپ اس پر ضرور غور کیجئے کہ کہیں آپ غیر شعوری طور پر کسی دکان کے چلانے میں مدد تو نہیں دے رہے ہیں۔

ہمارے یہاں آج کل غلط لکھنے والے، صحیح سمجھنے والوں سے زیادہ ہیں، اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

(علی گڑھ، ۲۴/اپریل ۶۷ء)

☆☆☆



## ذاکر صاحب کے ملفوظات

سیشن کا آغاز ہوتا تو ذاکر صاحب یونین کے پلیٹ فارم سے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: جو دوست بنانا ہو اسی زمانہ میں بنالو، جب تم اسکول اور کالج میں پڑھ رہے ہو۔ پھر جو تم سے ملے گا، وہ اپنے مطلب سے ملے گا، تمہارا بے لوث دوست کوئی نہ ہوگا۔

آگے بڑھ کے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ پرانے دوست کیا، پرانے دشمن بھی مشکل سے ملتے ہیں، اس لئے جو بھی تمہارے اُس زمانہ کے دوست دشمن ملیں ان کی قدر کرو؛ دشمنوں کی بھی۔

# نئے ہندستان کے ''اکلاویہ''

تحریر: ہرش مندر/ مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں

پسماندہ طبقات کے بچوں کے لئے، عمدہ پرائیویٹ اسکولوں میں نشستیں مخصوص کرنے کی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس کا ذریعہ ہندستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں موجود نہایت منظم عدم مساوات کے باوجود، پہلی بار، غریب وامیر خاندانوں کے بچے ایک ساتھ پڑھ، کھیل اور کھا سکیں گے: ایک ایسے ملک میں جہاں سیکڑوں سالوں سے، لاکھوں بچوں کو کسی بھی طرح کی تعلیم حاصل کرنے سے، صرف ان کے کسی ذات میں ''اتفاقیہ'' پیدا ہو جانے کی وجہ سے محروم رکھا گیا تھا۔ یہ حال میں نافذ کیا گیا ''جدید قانون'' ہمارے لاکھوں ''اکلاویوں'' کو گو تاخیر سے ہی سہی، تہذیب وشائستگی حاصل کرنے کا ایک نادر موقع فراہم کراویگا۔

تعلیمی نظام میں صدیوں سے موجود، رنگ وبھید کے اس امتیاز کو ختم کر کے، ہمارے اسکولوں میں پسماندہ بچوں کی موجودگی سے ان اسکولوں کے ''کلاس روموں'' کو صحیح معنی میں جمہوری بنانے کا یہ عمل ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل بن جائے گا، بالکل اسی طرح، جس طرح امریکہ میں ۱۹۶۰ء کے شہری حقوق کی تحریک میں ہوا تھا، اسکولوں میں نسلی امتیاز کے سلسلے میں ۱۹۷۰ء میں جس طرح کی بحث امریکہ میں چلی تھی، تعجب ہے کہ نہایت پُر اسرار طور پر، اسی طرح کی باتیں، آج ہندستان میں بھی پسماندہ طبقات کے بچوں کے لئے پرائیویٹ اسکولوں میں سیٹیں مخصوص کرنے کے سلسلے میں بھی سننے میں آرہی ہیں۔ کچھ لوگ اس کو پرائیویٹ سیکٹر کے حقوق پر غاصبانہ حملہ قرار دے رہے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ غریب اور چھوٹی ذاتوں کے بچے، ایک ''یکساں ماحول'' میں اپنے آپ کو ''فٹ'' نہیں کر پائیں گے، اس لیے ان کو علیحدہ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ اس کے علاوہ دوسروں نے اور زیادہ بد دماغی کے حامل بیانات دیئے ہیں، جیسے ''غریب بچے پرائیویٹ اسکولوں کے عمدہ برداراسٹینڈرڈ کو تباہ وبرباد کردیں گے'' وغیرہ۔ ملک کے عمدہ پرائیویٹ اسکولوں نے، بجائے اس کے کہ اس عمدہ اور منصفانہ ذمہ داری کو جوان کو سونپی گئی تھی، قبول کرنے کے، مشہور اور نامی وکیلوں کی ایک فوج تیار کرنا شروع کر دی تھی، تاکہ غریب بچوں کے داخلہ کے سلسلے میں اس قانون کو آئینی طور پر غلط قرار دیئے جانے کے لئے سپریم کورٹ سے رجوع کر سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ ''رفاہ عام یا خدمت عامہ'' کے بطور تعلیم کا انتظام کرے،

وہ اپنے اس آئینی فرض کو پرائیویٹ اسکولوں کو منتقل نہیں کر سکتی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ گورنمنٹ کو ان اداروں میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے، جس کا مطلب یہ ہی تھا کہ ان کے خیال سے صابن بیچنے اور تعلیم بیچنے میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس قانون میں یہ شق موجود تھی کہ گورنمنٹ ہر پرائیویٹ اسکول کو، ہر غریب بچے کے داخلہ کے لئے دس ہزار سے بیس ہزار روپیہ سالانہ مہیا کروائے گی۔ لیکن ان پرائیویٹ اسکولوں کا کہنا تھا کہ یہ رقم نہایت قلیل ہے، جس کی وجہ سے یا تو ان کو فیس بڑھانا پڑے گی، یا پھر ان اسکولوں کو اپنا اسٹینڈرڈ نیچے گرانا پڑے گا، یا پھر ان اسکولوں کے ذریعہ جو منافع ہوتا ہے اس میں بھاری کمی واقع ہوگی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر زبردستی غریب لڑکے ان کے اسکولوں میں داخل کئے گئے تو ان کے اسکولوں کا مخصوص (جسے اعلیٰ کہنا چاہیے) کردار ختم ہو جائے گا۔

گورنمنٹ نے سپریم کورٹ میں داخل کئے گئے اپنے حلف نامہ میں اس قانون کے سلسلے کی عقلی دلائل کو نہایت عمدگی سے پیش کیا تھا۔ پرائیویٹ اسکول، نفع کمانے کے لئے اختیار کیا گیا کوئی پیشہ نہیں ہوتا ہے، اگر اس کو گورنمنٹ کی کوئی گرانٹ نہیں بھی ملتی ہے تب بھی ایک تعلیمی ادارہ ہونے کی وجہ سے اس پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ زیادہ جمہوری اور مساوات پر مبنی ''کلاس روموں'' کو بڑھاوا دے، جہاں مختلف طبقات اور مختلف سماجی گروہوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کو باہمی میل جول کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقع مل سکے، جہاں وہ اختلافات اور تنوع کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کی عزت کرنا سیکھ سکیں، اور اس طرح ایک رواداری کا حامل، بہتر انسانی سماج تشکیل کیا جا سکے۔ یہ اس بات کی ضمانت فراہم کرواتا ہے کہ مساوات پر مبنی کلاس روم، بااختیار افراد کے بچوں اور محروم طبقات کے بچوں کو ایک ساتھ تعلیم دینے کا طریقہ زیادہ بہتر تعلیم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں کی انتظامیہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ غریب طبقات کے بچوں کے اسکول میں آنے سے، ان کی خراب کارکردگی کی وجہ سے، ان اسکول کے معیار کے گرنے کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے، جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہی ہے کہ بنیادی طور پر یہ طلبا کم محنتی ہوتے ہیں، حالانکہ آپ ان محروم طبقات کے بچوں کا مقابلہ امیر و کبیر پڑھے لکھے والدین کے نازنخروں میں پلے ان بچوں سے کس طرح کرسکتے ہیں، جن کے لئے گھروں پر ہر طرح کی ٹیوشن اور دوسری تمام آسودہ زندگی کی سہولیتیں موجود ہوتی ہیں۔

کیا اس طرح کے بچوں کا مقابلہ اس لڑکی سے کیا جا سکتا ہے جو ایک نہایت گندی جھونپڑی میں پلی بڑھی ہے، جس کے ماں اور باپ مطلق ان پڑھ ہیں، جو روز کی مزدوری پر اپنا گزر کرتے ہیں، جس کے لئے نہ پڑھنے کی کوئی جگہ ہے، اور نہ ہی کوئی اس کو ہوم ورک میں مدد کرنے والا موجود ہے، جو کھلے میں ایک نل کے نیچے نہانے کے لئے مجبور ہے، اس کے ساتھ جس کے سر پر کھانا پکانے اور پانی لانے کی ذمہ داری کے ساتھ ہی، چھوٹے بھائی بہن کی دیکھ ریکھ بھی شامل ہے۔

ان ''اعلیٰ اسکولوں'' کے منتظمین کا ایک دوسرا گمراہ کن جواز یہ بھی تھا کہ ''اعلیٰ اسکولوں'' میں غریب طبقات کے بچوں کو داخل کرنے سے خود ان بچوں کو بہت نقصان پہنچے گا۔ جنوبی بمبئی کے ایک اسکول کے پرنسپل نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کس طرح غریب طبقات کے بچے، اس علاقہ کے امیر اور باثروت خاندانوں کے بچوں کے ساتھ برابری سے رہ سکیں گے۔ اس کے ساتھ ہندستان ٹائمز میں شایع ہونے والے ایک آرٹیکل میں بسنتی رائے نے لکھا تھا کہ جھگی جھونپڑی میں رہنے والے بچوں کے لئے باثروت گھرانوں کے بچوں کے ساتھ رہنا کافی مشکل اور تکلیف دہ امر ہوگا۔ غریب بچے، ان اسکولوں کے ماحول میں ہمیشہ ایک اجنبی بنے رہیں گے، ان کے درمیان ثقافتی (کلچرل) فرق ہمیشہ موجود رہے گا۔

ہندو کی سنڈے میگزین میں، اے کمار سوامی نے لکھا تھا کہ وہ بچے جن کو اپنے خاندان کے افراد سے پڑھنے لکھنے میں مدد نہیں ملتی ہے وہ ہمیشہ اپنی کلاسوں میں سب سے پیچھے رہتے ہیں، اسی وجہ سے وہ دوسروں سے مقابلہ نہیں کر پاتے ہیں، اسی کے ساتھ ان کو اپنی سماجی حیثیت کی وجہ سے بھی متعدد مشکلات پیش آتی ہیں۔ یعنی ان کا لباس، ان کے پاس موجود مختلف چیزیں ان کے والدین کا رکھ رکھاؤ وغیرہ، ایک غریب طبقہ کے بچے کی خود اپنی نظروں میں اپنی عزت کم کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ اعلیٰ اسکولوں میں غریب طبقات کے بچوں کو امیر والدین کے بچوں کے ساتھ پڑھایا جائے بہتر یہ ہی ہوگا کہ ان بچوں کی پڑھائی کے لئے علیٰحدہ اسکول قایم کئے جائیں۔

یہ ہی وہ جواز تھے جو لفظ بلفظ، اعلیٰ اسکولوں کے منتظمین دہلی گورنمنٹ کے ۲۰۰۲ء کے اس آرڈر کے خلاف دہرا رہی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ دہلی کے تمام اسکول ۱۵ فیصد نشستیں، غریب بچوں کے لئے مخصوص کریں۔ ان اسکولوں نے ان بچوں کے لئے شام کے اسکول کھولے جن میں دن کے مقابلے میں نہایت خراب پڑھائی کا انتظام تھا، یہ شام کے اسکول خاص طور پر ''ہندی میڈیم'' اسکول تھے۔ میں نے دہلی میں اس ''کوٹے'' کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، بہت سے نہایت اعلیٰ اسکولوں میں اپنے سڑکوں پر رہنے والے بچوں کو، جن کی ہم دیکھ ریکھ کرتے ہیں، داخل کروانے کی کوشش کی تھی، لیکن ان اسکولوں میں سے ہر ایک نے میری درخواست کو نامنظور کر دیا تھا، ہاں دو ایک نے علیٰحدہ سے بنائے گئے، شام کے اسکولوں میں، کچھ بچوں کو داخل کرنے کی رضامندی ظاہر کی تھی۔

اس جھوٹ کی سچائی کہ غریب بچے کبھی امیر گھرانوں کے بچوں کے ساتھ باہمی مساوات کے ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں، سابق میں، سڑکوں پر رہنے والے ہمارے ان چند بچوں نے کھل کر ثابت کر دی ہے، جن کو سینٹ میری، جامعہ ملیہ، اور بلونت رائے مہتا جیسے اسکولوں میں داخلہ مل گیا تھا، ان اسکولوں میں ہمارے بچے جلد ہی پڑھائی لکھائی میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے لگے تھے، اور اپنے کلاسوں میں اول آنے کے ساتھ اسپورٹس اور کلچرل ایکٹیوٹیز جیسے میوریک، ڈالق وغیرہ میں بھی اپنے جوہر دکھلانے کے ساتھ ہی انہیں امیر گھرانوں کے بچوں کے ساتھ دوستیاں کرنے اور گھل مل کر رہنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

# عربی ادب میں کتاب الاغانی کی عظمت

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

ابو الفرج علی بن حسین (۲۸۴ھ-۳۵۶ھ) اصفہان میں پیدا ہوئے۔ بغداد میں ان کی نشو ونما ہوئی۔ علماء کی مجالس میں شریک ہوئے۔ احادیث بھی سنیں، علوم وفنون میں مہارت پیدا کی۔ ان کے علم وفضل کی شہرت ہوئی۔ وہ بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے لئے لکھتے بھی تھے خصوصاً جو حکومت بنی امیہ کی اندلس میں قائم تھی اس کے لئے خفیہ طور پر لکھتے اور اس کا معاوضہ ان کو ملتا تھا۔ وہ شیعہ تھے مگر تقیہ کرتے تھے اور بنی امیہ سے مال حاصل کرتے تھے۔ بنی بویہ کے وزیر مہلبی کی مدح کرتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے خوشحالی کی زندگی گزاری، ۳۵۶ھ میں بغداد میں انھوں نے انتقال کیا۔

ان کی سب سے مشہور تصنیف کتاب الاغانی ہے، مؤرخین کا اجتماع ہے کہ اتنی اعلیٰ ادبی کتاب کسی نے تصنیف نہیں کی۔ یہ کتاب انھوں نے ۵۰ برس میں مکمل کی ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو جاہلیت کے اخبار، صدر اسلام کی روایتیں اور بنی امیہ کی تاریخ کے ادبی قصے اور روایات سب ضائع ہو جاتیں، جب یہ کتاب الاغانی، اصفہانی نے سیف الدولہ حمدان کو پیش کی تو انھوں نے ایک ہزار دینار ان کو انعام دیا۔ یہ کتاب ۲۱ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلے یہ کتاب لائیڈن میں ۱۹۰۰ء میں چھپی، پھر مصر میں دار الکتب المصریۃ نے اس کو شائع کیا۔ (ملاحظہ فرمائیے تاریخ الادب العربی از احمد حسن زیات، ص نمبر ۲۶۵، ۲۶۶، شائع کردہ دار المعرفۃ بیروت، لبنان، نواں ایڈیشن ۲۰۰۴ء)

تمام راویوں کا متفقہ بیان ہے کہ ابو الفرج اصفہانی نہایت گندہ رہتا تھا، کپڑا ایک پہنتا تھا، اس کو نہ دھوتا تھا اور نہ اتارتا تھا یہاں تک کہ وہ پھٹ جاتا تھا۔ غسل کبھی نہیں کرتا تھا۔ جوتے صاف نہیں کرتا تھا، جسم میں کپڑوں میں اور جوتوں میں میل اور گندگی بھری رہتی تھی۔

اغانی ایک دائرۃ المعارف ہے جو ۲۰ جلدوں سے زائد پر مشتمل ہے۔ جس کو ابو الفرج اصفہانی نے تصنیف کیا ہے، تاکہ اس سے امراء اور طبقۂ اشراف راتوں کو قصہ کہانی کی طرح پڑھے اور لطف اٹھائے۔ اس کا مقصد تاریخ لکھنا اور علمی معلومات فراہم کرنا نہ تھا۔ خود اصفہانی کا تعلق عربوں اور مسلمانوں کے دشمن گروہوں سے تھا یعنی وہ باطنیوں اور شعوبیوں میں سے تھا۔ اس کا یہ کام در اصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک ادبی وسماجی منفی تحریک کے مترادف ہے۔ جس کا آغاز شعوبیوں نے کیا تھا تاکہ اسلامی فکر کو نقصان

پہنچا کر اسلامی معاشرہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا جائے۔

مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے ناقدوں نے اس کتاب کو بطور ماخذ اختیار کیا ہے اور اسلامی معاشرہ کی تصویر کشی اس کے ذریعہ کی ہے۔ ڈاکٹر طہٰ حسین نے اس سلسلہ میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے، انھوں نے اسلامی سوسائٹی اور تاریخ پر لکھتے وقت اغانی کے قصوں پر اعتماد کر کے روشنی ڈالی ہے، اور مغربیت پسندی کو عام کیا ہے۔ اور ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو بالکل خودساختہ اور غلط ہیں۔

اصفہانی درحقیقت شعوبی تھا اور مؤرخین و علماء نے صاف لکھا ہے کہ وہ مؤرخ نہ تھا اور اس کی کتاب پر تاریخی واقعات میں بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ اس کی کتاب ان قصوں کا مجموعہ ہے جو بازاری تھے اور جو اس نے مغنیوں کے لئے جمع کیے تھے۔ وہ اسلامی معاشرہ کے متعدد پہلوؤں میں صرف ایک پہلو قرار دیا جا سکتا ہے، ورنہ اسلامی معاشرہ عصر عباسی میں علماء، فقہاء، محدثین اور صوفیاء سے پُر تھا۔ اصفہانی کے معاصر علماء نے اس کے بے دین ہونے اور شرابی ہونے کی شہادت دی ہے، مؤرخ یوسفی نے لکھا ہے (جو خود ایک معتبر عالم تھے اور اس کے معاصر تھے):

''ابوالفرج لوگوں میں سب سے بڑا جھوٹا تھا، وہ کتابوں کی دوکانوں میں جا کر فضول کی کتابیں تلاش کر لاتا تھا اور کئی کتابیں خریدتا تھا اور اسی سے قصے نقل کر دیتا تھا (بغیر حوالہ کے)''

معجم الادباء کے مصنف یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ:

''اس کا حال شراب خوری میں لونڈوں سے عشق کرنے میں اور عورتوں کے وصف بیان کرنے میں شعراء کی طرح تھا جو اس کے دور میں یا اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ وہ معروف شرابیوں کی محفل میں شریک ہوتا تھا اور اکثر ان میں نصاریٰ، یہود، مجوس اور صابی ہوتے تھے، اس کی شراب خوری معروف ہے، وہ اپنے کپڑوں اور جسم کی صفائی کی جانب توجہ نہ کرتا تھا'' (معجم الادباء، ج۱، ص۱۸۳ء)۔

صابی نے وزیر مہلبی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

''ابوالفرج اصفہانی گندہ تھا، کپڑے نہ دھوتا تھا، نیا کپڑا پہنتا تھا پھر اس کے جسم پر پھٹ جاتا تھا (نہ دھوتا تھا اور نہ بدلتا تھا)، لوگ اس کی زبان (ہجو) سے ڈرتے تھے۔ اس کی محفل سے احتراز کرتے تھے، اس کی معاشرت (برداشت کرنا) بڑا مشکل مرحلہ تھا، اس لئے کہ اس کے کپڑے، جسم اور جوتے سب گندے تھے'' (منارالاسلام، ص۷۵)۔

قاضی ابوعلی محسن تنوخی نے اپنی کتاب ''شعراء المحاضرۃ'' میں لکھا ہے کہ ابوالفرج بہت کھانے والا تھا، سخت بھوکا رہتا تھا، یعنی حریص واکول تھا۔ جب زیادہ کھانا کھا جاتا تو ۵ درہم کی فلفل پسی ہوئی خرید لیتا اور کھا جاتا، جس سے نہ اس کی آنکھوں سے آنسو آتے اور نہ اس کو تکلیف ہوتی، گھنٹہ دو گھنٹے بعد اس کو پسینہ آتا اور وہ ٹھیک ہو جاتا''۔ (منارالاسلام، ص۷۵)۔

ذکی مبارک اپنی کتاب ''النثر الفنی فی القرن الرابع الھجری'' میں اصفہانی کے بارے میں لکھتے ہیں یہ ایک بڑی کتاب ہے، جس کے بارے میں ایک پہلو پر میں زور دینا چاہتا ہوں جو ادبی زندگی کو سمجھنے میں اہمیت کے حامل

ہے اور جس کے بارے میں ادب و تاریخ کے علماء کو احتیاط کی ضرورت ہے کہ، اگر کوئی قصہ اغانی میں ہو تو اس بارے میں تفتیش و احتیاط کی ضرورت ہے۔

اصفہانی نہایت سخت لذت پرست انسان تھا۔ یہ لذت پرستی خود اس کی کتاب سے ظاہر ہے۔ جس میں اس نے فحش قصوں کا انبار لگا دیا ہے۔ وہ عمداً شعراء کے ایسے قصے پیش کرتا تھا جو حرص وھوا سے مملوٴ ہیں۔ وہ شعراء کے ان واقعات کو نظر انداز کر دیتا تھا جو شرافت اور عظمت کے آئینہ دار ہوں۔ جن مصنفین نے کتاب الاغانی پر بھروسہ کیا وہ غلط استنتاج کے مرتکب ہوئے۔ تاریخ الآداب العربیۃ میں جرجی زیدان نے الاغانی پر بھروسہ کیا اور بہت سی غلطیوں کے مرتکب ہوئے۔ اس طرح طہٰ حسین نے کتاب الاغانی کو مأخذ بنایا اور انھوں نے اسی بنا پر عصر عباسی کو عصر فسق و فجور قرار دیا۔ اصفہانی نے فحش قصوں کا انبار لگا دیا جس کی وجہ سے لوگوں نے عصر عباسی کو عصر فسق و فحش قرار دیا۔ خود مصنف الاغانی نے اپنے مقدمہ کتاب میں لکھ دیا ہے کہ میں نے ایسے قصے جمع کر دیے ہیں جن سے لوگ لطف و لذت حاصل کریں۔ یہ کتاب تاریخی اہمیت نہیں رکھتی، یہ قصے کہانی کی کتاب ہے۔ اس میں امیروں کی محفلوں کے فحش قصے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں لہو ولعب کی کہانیاں ہیں، اس میں لذت پرستوں کی تسکین کا سامان ہے۔

جرجی زیدان نے تاریخ التمدن الاسلامی میں الاغانی سے استفادہ کر کے اسلام کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس پر علامہ شبلی نے تنقید کی ہے۔ جن لوگوں نے اغانی کو ماخذ بنا کر کتابیں لکھیں انہوں نے غلط نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس لئے کہ اصفہانی نے لہو ولعب کو اپنا بنیادی مقصد بنا کر اس طرز کی چیزیں جمع کر دی ہیں۔ جرجی زیدان کے علاوہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے حدیث الاربعاء میں اس پر اعتماد کیا ہے۔ مستشرق لامنس نے تاریخ بنی امیہ میں اس کو ماخذ قرار دیا ہے، مستشرق فلھوزن نے ''دولت عباسیہ اور اس کا سقوط'' میں اغانی کو مرجع بنایا ہے۔ جبور عبدالنور جو امریکن یونیورسٹی بیروت میں صدر شعبۂ عربی ہیں اصفہانی کی مدافعت میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی انسان شہوت پرست ہو تو کیا وہ مؤرخ نہیں ہوسکتا اور اس کی اولیت صحیح تصور نہیں کی جاسکتی''۔ واقعی مسلمان مؤرخین ومحدثین عیاشی پسندوں فسق وفجور میں مبتلا لوگوں کی روایت قبول نہیں کرتے۔ یہ معروف حقیقت ہے۔ جس کا اخلاق و دین صحیح نہ ہو اس کی روایت ہم رد کر دیتے ہیں۔ اصفہانی غیر ثقہ انسان ہے ساقط الشہادۃ ہے، اغانی قصہ کہانی کی کتاب ہے، تاریخ کا ماخذ و مرجع بننے کے لائق نہیں۔ (دیکھئے رسالہ المنارج، ۱۰ جون ۱۹۸۵ء و مقالہ از انور الجندی، ص نمبر ۷۴ تا ۷۷)۔

ابوالفرج اصفہانی کا حافظہ غضب کا تھا اس نے بے شمار اشعار یاد کئے تھے۔ عربوں کی ادبی روایات، قصے، نسب نامے، اساطیری سوانح حیات، علم نجوم اور تمام ادبی علوم کے بارے میں اس کی یادداشت علم کا ایک عمدہ خزانہ تھی، کتاب الاغانی اس کی سب سے بڑی کتاب ہے اس نے اس کتاب پر عمر کے ۵۰ برس صرف کئے ہیں، اس نے اس کو صرف ایک بار اپنے قلم سے لکھا تھا اور یہ نسخہ مشہور علم نواز بادشاہ سیف الدولہ بن حمدان کی خدمت میں پیش کیا اس نے خوش ہو کر سونے کے ۱۰۰۰ دینار عطا کئے اور

معذرت بھی کی۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب بن عباد وزیر اپنے ساتھ ۳۰ اونٹ بھر کر کتابیں لے جاتا تھا اپنے سفر میں جب کتاب الاغانی اس کو مل گئی تو صرف یہی کتاب ساتھ رہتا تھا اور باقی چھوڑ دیتا تھا، اس واقعہ سے اس کتاب کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ واقعہ ہر تاریخ ادب کی کتاب میں موجود ہے۔

اصفہانی کثیر التصنیف تھا، اس نے کتاب القیان، کتاب الاماء الشواعر، کتاب مقاتل الطالبین، کتاب دعوة الاطباء لکھیں، وہ خفیہ کتابیں لکھ لکھ کر اندلس بھیجتا تھا اور وہاں سے اس کو انعام بھی عطا ہوتے تھے۔ اس لئے کہ عباسیوں میں رہ کر اندلس کے اموی حکمرانوں کی تعریف کھلم کھلا کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس کی اس طرز کی کتابیں جو اس نے اندلس کے امراء اور بادشاہوں کے لئے تصنیف کی تھیں، ان میں نسب بنی شمسیہ اہم کتاب ایام العرب تھی، جس میں ایک ہزار جنگوں کا حال ہے۔

شیخ محمد خضری نے کتاب الاغانی پر عمدہ تبصرہ کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ جس طرح بے ترتیب اصفہانی کی زندگی تھی بالکل اسی طرح غیر منظم اور بے ترتیب اس کی کتاب الاغانی بھی ہے۔ اس نے ساری کتاب کو اشعار، واقعات اور نوادرات سے بھر دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں کوئی اصول یا نظام پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ اس پھیلے ہوئے اور بے ترتیب مواد کا خیال خود اصفہانی کو بھی آیا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک کتاب ''مجرد الاغانی'' لکھی تھی۔ بہر حال دور جدید میں شیخ محمد خضری نے اس جانب توجہ کی اور کتاب کو دوبارہ مدون کیا۔ شعراء کا تذکرہ الگ کر دیا، اور ان کو تین طبقات میں تقسیم انھوں نے قبائل کے اعتبار سے کی۔ پہلے طبقہ میں جاہلی شعراء کو رکھا، دوسرے میں اسلامی دور کے شعراء کو شامل کیا بنی امیہ تک۔ پھر تیسرے میں محدثین کو لیا اور ابو تمام تک اکثر شعراء کا ذکر کیا۔ حضرمی شعراء کا ذکر جاہلیت و اسلام اور اموی و عباسی کو اس میں شامل کیا، مگر یہ عربی تاریخ نگاروں کے قاعدے کے خلاف ہے، اموی وعباسی دور کے شعراء کو حضرمی تصور نہیں کہا جاتا، اس لئے کہ کوئی اتنا بڑا انقلاب نہیں آیا جتنا جاہلیت اور اسلامی دور میں آیا تھا اور پورا معاشرہ بدل گیا تھا، اگر چہ اصطلاحاتی تقسیم صحیح ہے، خضری نے بہت زیادہ فحش اشعار حذف کر دئے جو معاشرہ برداشت نہیں کر سکتا۔ راویوں کے نام اور اسانید بھی انھوں نے خارج کر دیں، ۲۱ جلدوں پر مشتمل اغانی کو خضری نے بڑے سائز کی دس جلدوں میں پیش کر دیا۔

اگر چہ وہ اندلس کے اموی بادشاہ کی تعریف کرتا تھا مگر اندر اندر شیعہ تھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور اس درجہ کا کہ لوگ اس کی ہجو سے ڈرتے تھے، اور اس کی مدح سے خوش ہوتے تھے۔ اس کا ایک عمدہ قصیدہ (نظم) ہے، جس میں چوہے کی شکایت کی ہے جس نے اس کا کپڑا کاٹ ڈالا تھا، پھر اس کے خلاف چوہے سے مدد بھی مانگی تھی۔

☆☆☆

# مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ

**پروفیسر بدرالدین الحافظ**
سابق صدر شعبۂ عربی، بنارس ہندو یونیورسٹی

غالباً ۴۴ء کے مہینہ میں خاکسار کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا جب مدرسہ شاہی مرادآباد میں قرآن کریم حفظ کرنے کے لئے داخل کرایا گیا، اس سے قبل میں نے دارالعلوم دیوبند کا نام تو سنا تھا کیوں کہ ہمارے خاندان کے پہلے عالمِ دین مولانا مظفر الدین وہیں کے تعلیم یافتہ تھے مگر ندوۃ العلماء لکھنؤ کا نام میں نے مدرسہ شاہی میں آ کر سنا۔

انہی دنوں ۱۹۴۴ء میں بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاسؒ کا وصال ہوا تھا اور ان کے صاحب زادے مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ ان کے جانشین مقرر ہوئے تھے، مولانا الیاس صاحب کی وفات کے بعد جماعت کا کام کرنے والوں کا حوصلہ اور ولولہ کافی بڑھا ہوا تھا، میوات کی اصلاح کا نمونہ ان کے سامنے تھا، اس لئے ہر شہر میں اس کام کی اہمیت کا شدت سے احساس بڑھ رہا تھا، اسی سلسلے میں غالباً ۴۵ءیا ۴۶ء میں جماعت کا ایک عظیم اجتماع مدرسہ شاہی میں منعقد ہوا، تین دن تک تعلیم بھی معطل رہی اور درس گاہوں میں جماعت کے لوگوں کا قیام ہوا، اس عظیم اجتماع میں شرکت کرنے کے لئے جو علماء کرام تشریف لائے ان میں مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مشہور عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو میں نے پہلی بار وہاں دیکھا تھا، گویا کسی ندوی عالم سے یہ پہلی ملاقات تھی اس کے بعد ۵۲ء میں جب دارالعلوم دیوبند جانا ہوا تو ندوہ کے پڑھے ہوئے بہت سے طلباء سے ملاقات رہی ان میں مولانا علاء الدین ندویؒ سے تاحیات رابطہ قائم رہا، پھر ۵۵ء میں جب جامعہ ملیہ دہلی آنا ہوا تو طلباء میں مولانا احتشام احمد ندوی، مولانا محمد ابراہیم ندوی مولانا محمود الحسن ندوی سے ملاقات ہوئی اور اچھی رفاقت کا رشتہ قائم ہوا۔

اساتذہ میں پہلی بار پروفیسر عبالحلیم ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ (۱۹۰۷ء-۱۹۷۹ء) سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت جامعہ کالج میں اسلامیات اور عربی کے دو اساتذہ تھے۔ ایک مولانا اسلم جیراجپوری اور دوسرے مولانا عبدالسلام قدوائی۔ مولانا اسلم جیراجپوری (مرحوم) کا رعب اور وجاہت ایسی تھی کہ ان سے ملنے کی کم ہی ہمت ہوتی۔ مولانا عبدالسلام قدوائی کو ۱۶/ جولائی یعنی داخلہ کے پہلے دن دیکھا تو ان کی وضع داری سادگی اور ملنساری میں کشش محسوس ہوئی۔ مولانا کو جب معلوم ہوا کہ دیوبند اور ندوہ سے کچھ طلباء ہائی اسکول کرنے کے ارادہ سے درجۂ خاص میں داخلہ کے لیے آئے ہیں تو وہ ہم لوگوں سے اس طرح ملے جیسے کوئی بچھڑا ہوا بڑا بھائی اپنے سگے بھائیوں سے آن ملا ہو۔ ہر ایک سے انفرادی تعارف حاصل کیا، قیام وطعام کے مسائل معلوم کئے اور ضروری ہدایات دیں اس کے بعد ان کا معمول بن

گیا کہ جب بھی کالج تشریف لاتے مدارس کے طلباء کی مزاج پُرسی ضرور کرتے، دوران تعلیم ہماری کوئی کلاس ان کے پاس نہیں تھی، مگر ان سے علمی استفادہ برابر ہوتا رہتا جس کا خاص ذریعہ ان کا جمعہ کا دلنشیں خطبہ ہوتا تھا، اس زمانہ میں مولانا عبدالسلام صاحب ناظم دینیات تھے اور مدرسہ ابتدائی کے استاد عبدالغفار مدھولی صاحب نائب ناظم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میں عام طور پر نماز پڑھنے محمد علی ہال میں آتا جو مدرسہ ابتدائی کے قریب واقع تھا، اور باقاعدہ مسجد نہ ہونے کی وجہ سے اسی ہال میں پنج وقتہ نمازیں ادا کی جاتیں اور جمعہ کی نماز مولانا عبدالسلام پڑھاتے، ان دنوں صرف اوکھلا گاؤں کی ایک ہی مسجد تھی جس میں جمعہ کی نماز ہوتی تھی، آس پاس دور دور تک نہ کوئی آبادی تھی اور نہ مسجد تھی۔ اس لئے جامعہ برادری کے بیشتر اساتذہ طلباء اور کارکنان یہیں جمعہ کی نماز ادا کرتے۔ اس کے علاوہ خاص طور پر مولانا عبدالسلام صاحب کا مختصر خطبہ بھی نمازیوں کی کشش کا سبب تھا۔ بلکہ بسا اوقات سنا گیا کہ کمیونسٹ ذہن کے لوگ بھی مولانا کا خطبہ سننے کے لئے جمعہ کی نماز پڑھنے ضرورت آتے۔ اس صورت میں یہاں ایک سال گزر گیا اور حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ ۱۶/اگست ۱۹۵۶ء سے میرا مدرسہ ابتدائی میں استاد اسلامیات کی حیثیت سے تقرر ہوگیا اور اب میں باقاعدہ محمد علی ہال میں پنج وقتہ امامت کی خدمت بھی انجام دینے لگا۔ اور چوں کہ عبدالغفار مدھولی صاحب، نائب ناظم دینیات تھے انھوں نے بڑی شفقت سے فرمایا کہ بھائی میں تو عالم نہیں ہوں اور نظامت دینیات کے منصب کے لیے کوئی عالم ہی ہونا چاہیے، اس لئے ایک سال آپ میری نگرانی میں اس کام کو سمجھ لیجئے اس کے بعد میں استعفیٰ دے دوں گا اور آپ ہی یہ کام سنبھال لیے گا۔

ادھر مولانا عبدالسلام صاحب نے بھی کئی بار انکساری سے فرمایا کہ بھائی میں تو نام کا ناظم دینیات ہوں۔ کام تو مدھولی صاحب کرتے ہیں اور اب آپ سمجھ لیجئے تو کام آپ کو کرنا ہے، لہٰذا میں نے بڑی دلچسپی سے کام شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں عبدالغفار صاحب نے بتایا کہ دینیات کے اہم کاموں میں سال میں ایک بار سیرۃ النبی کا جلسہ منعقد کرانا، ختم تراویح کے موقعہ پر فضائل قرآن کریم سے متعلق ایک مختصر جلسہ کرانا، رمضان المبارک میں تراویح کا انتظام کرنا، اور عیدین کی نماز کا انتظام بھوپال گراؤنڈ میں کرنا ہے، محمد علی ہال کے لئے بجٹ کے مطابق صفیں خریدنا، جبکہ ان کاموں کے لیے ہمارا بجٹ صرف ایک ہزار روپے تھا بعد میں وہ گھٹ کر آٹھ سورہ گیا مگر اس میں یہ سب کام بخوبی ہوجاتے تھے، مولانا عبدالسلام قدوائی جمعہ کو تشریف لائے تو ان سے ضروری کام کے لیے گفتگو ہوجاتی، اس طرح میں نے تقریباً ۱۵ سال تک مولانا عبدالسلام کے نائب کی حیثیت سے کام کیا مگر مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ میرا ان کا رشتہ افسر اور ماتحت کا ہے، وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے مفید مشورے دیتے اور یہ بھی فرماتے کہ میں تو برائے نام ناظم ہوں کام تو آپ ہی کرتے ہیں۔ سیرت النبیؐ کے جلسے کے لئے کسی بیرونی مقرر کا انتخاب بڑا اہم مسئلہ ہوتا تھا کیوں کہ مقرر ایسا ہونا چاہیے جو چھوٹے بڑے طلباء اور عوام کو مخاطب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور معروف شخصیت ہو۔ مولانا مرحوم کی نظامت میں ہم نے جن علماء کو مدعو کیا ان میں مولانا سید محمد میاں، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا علی نقی صاحب،

پنڈت سندر لال صاحب کے اسماء گرامی مجھے یاد ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا رضا فرنگی محلیؒ کو بھی مدعو کیا گیا مگر وہ باقاعدہ سیرۃ النبیؐ کا جلسہ نہیں بلکہ توسیعی خطبات کے لئے تشریف لائے تھے۔ غالباً ۶۰ء کے آس پاس مجلس دینیات نے مولانا قاری محمد طیب صاحب کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا تو ان سے رابطہ قائم کیا گیا اور انہی دنوں وہ ایک جلسہ میں دہلی تشریف لائے تھے تو مولانا عبدالسلام صاحب اور خاکسار مکتبہ جامعہ کی کار لے کر شہر گئے شاید پرانی عیدگاہ کے پاس کسی مسجد میں قاری صاحب کا خطاب تھا وہاں آپ سے ملاقات کر کے درخواست کی گئی۔ ابتداء میں مولانا عبدالسلام صاحب اپنا مختصر تعارف کرانے لگے تو قاری صاحب نے فرمایا: ارے حضرت میں آپ سے واقف ہوں، آپ کی بعض کتابیں بھی میری نظر سے گزری ہیں اس کے بعد چند منٹ باتیں ہوتی رہیں اور حضرت قاری صاحب نے وعدہ کر لیا، ڈائری میں نوٹ کرا دیا گیا مگر اتفاق سے ہماری مقررہ تاریخ سے قبل قاری صاحب علیل ہو گئے، اور جلسہ میں نہ آسکے۔ اس کے کئی ماہ بعد قاری صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا اور محمد علی ہال میں بڑے عظیم مجمع کو خطاب فرمایا۔

مولانا عبدالسلام صاحب کو میں نے خطبات جمعہ کے علاوہ کبھی کسی جلسہ میں خطاب کرتے نہیں دیکھا تھا مگر اتفاق سے ساتویں دہائی میں اوکھلا گاؤں کے کسی صاحب خیر نے ایک وسیع جگہ میں شامیانہ لگا کر جلسہ کا اہتمام کیا، اور خاکسار کو بھی بلایا اور خصوصی تقریر حضرت مولانا عبدالسلام کی تھی اس میں خاکسار تو چند منٹ بول کر بیٹھ گیا اور فکر یہ دامن گیر تھی کہ مولانا جو چند منٹ بولنے کے عادی ہیں اس لئے یہ بڑا جلسہ کتنی دیر تک چلے گا اور سامعین کیا محسوس کریں گے۔ مگر مجھے حیرت ہوئی کہ جب مولانا کھڑے ہوئے تو تقریباً سوا گھنٹہ بہترین انداز سے خطابت کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کے موضوع پر بولتے رہے اور جلسہ ختم ہوا تو لوگ عش عش کر رہے تھے۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ لکھنؤ میں بھی مولانا کی طویل تقریریں سنی گئی ہیں۔

خاکسار نے تو ان کے صرف خطبات جمعہ کی سماعت کا شرف حاصل کیا جو اپنی معجز بیانی میں بے مثال ہوتے تھے پھر نہ جانے ان کی ان مختصر تقریروں میں کیا شیرینی اور تاثیر ہوتی تھی کہ نمازی گردن اٹھا اٹھا کر ان کی آمد کا انتظار کیا کرتے اور جب وہ تشریف لے آتے تو چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی اور کبھی کسی مجبوری سے نہ آتے تو مایوسی کا اظہار کیا جاتا۔ وہ خطبہ کیا ہوتا تھا قرآنی آیات احادیث اور سلف صالحین کے مستند وموزوں اور مناسب واقعات سے گندھا ہوا ایک گلدستہ، ایسا گلدستہ جس کے گلہائے رنگا رنگ اگر ایک طرف تاریخ کے طالب کے لیے تسکین ذوق فراہم کرتے تو دوسری طرف تصوف کا شیدائی بھی اس میں اپنے لئے غذا تلاش کر لیتا پھر جہاں ایک عالم اس خطبہ کے رمز و کنایات، تشبیہات و اشارات سے بہت سی علمی گتھیاں سلجھاتا چلتا وہاں ایک ان پڑھ بھی اس کے سیدھے معقول واقعات کو اپنے لئے رہنما پاتا۔

اگرچہ مولانا مرحوم کے یہ خطبات مواد کے اعتبار سے اپنے جلو میں معاشرتی مذہبی سیاسی، اور سالانہ تقاریب وغیرہ سے مربوط مسائل لئے ہوتے تھے لیکن مذہبی روح اور دینی پیغام ان پر ہر طرح سے حاوی ہوتا تھا۔ مثلاً جامعہ میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا، طلباء کی آمد آمد ہے داخلے ہو رہے ہیں، گویا کام کا آغاز ہو رہا ہے تو اسی زمانہ میں مولانا کا خطبۂ نماز ''انما الاعمال بالنیات'' کے مفہوم پر مرکوز

ہوتا۔ اسی طرح سالانہ امتحان کے موقعہ پر مولانا کا خطبہ روزِ جزاء اور یومِ آخرت کے عنوان پر ہوتا جو صحیح معنوں میں موقع ومحل کے لحاظ سے ایک مربوط درس ہوتا تھا، ہر ہفتہ موضوع کے صحیح انتخاب کے بعد مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عنوان کے تمام پہلوؤں کو خلط ملط یا بے جا طوالت میں الجھاتے نہ تھے بلکہ موضوع کے صرف ایسے نکتہ کو لے کر چلتے جو عنوان کی جان ہوتا اور سامعین کے دل ودماغ کو اس کی حقانیت قبول کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ کر دیتا اور ایک خطبہ سننے کے بعد آدمی اگلا خطبہ سننے کے لیے بے چین رہتا۔ اب یہاں میں خطبات کا زیادہ تذکرہ نہیں کروں گا، کیوں کہ اس موضوع پر الگ ایک مقالہ قلمبند کر چکا ہوں۔

تفقہ فی الدین: مولانا کی قرآنی فکر اور اندازِ تفسیر پر قرآن مجید کی پہلی، دوسری اور تیسری کتابیں موجود ہیں، عربی زبان کے دس سبق بھی انھوں نے آسان قرآن فہمی کے نقطۂ نظر سے لکھی تھی مگر فقہی مسائل میں بھی ان کا ایک منفرد انداز تھا۔ ایک صاحب نظر اور بالغ فکر عالم ہوتے ہوئے کبھی مفتی کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے اگرچہ لوگ جمعہ کی نماز کے بعد اور مختلف ایام میں ان سے ہر طرح کے مسائل معلوم کرتے اور تسلی بخش جواب پاتے تھے۔ کبھی ہندستان کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگ جامعہ کے سربراہ شیخ الجامعہ کو عالم اور مفتی سمجھ کر ان کے نام استفتاء بھیج دیا کرتے اور شیخ الجامعہ کے دفتر سے وہ فتوی مولانا کے پاس آجاتا اور آپ اس کا جواب تحریر فرماتے، مجھے اس کا علم تھا مگر مولانا کی موجودگی میں تو کبھی خود لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ہاں مولانا کی سبکدوشی کے بعد جب خاکسار کو ناظم دینیات بنایا گیا تو کبھی کبھی مجھے بھی یہ خدمت انجام دینی پڑی لیکن اس سلسلہ میں مولانا کی غایت احتیاط کی ایک مثال یہاں ضرور پیش کروں گا۔ اس زمانہ میں ٹی۔ وی تو تھا نہیں۔ ٹیلیفون کی سہولیات بھی محدود تھیں لوگ ریڈیو سے رویت ہلال کی خبریں سنتے یا دہلی شہر کے اعلان کا انتظار کرتے، ایک سال ہوا یہ کہ ڈھاکہ اور کراچی میں عید کے چاند کا اعلان کر دیا گیا، کیرالہ میں بھی عید کا اعلان ہو گیا باقی شہروں میں تذبذب اور یقین حاصل کرنے کا ماحول بنا ہوا تھا، لوگ اعلان کے لیے ادھر ادھر سرگرداں پھر رہے تھے، ایسے حالات میں مولانا نے جغرافیائی کیفیت کا اندازہ لگایا کہ ڈھاکہ اور کراچی میں چاند ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ رویت ہو چکی ہے اور تھوڑی دیر میں ہندستان کے شہروں میں بھی اعلان ہو جائے گا مگر مولانا خود نہ شہر کے مفتی کی حیثیت رکھتے تھے نہ رویت ہلال کمیٹی کے ذمہ دار تھے مگر خود اپنی صوابدید اور علم وفراست کے مطابق خود عمل کرنے کا حق رکھتے تھے اسی لیے انھوں نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور صبح ۹ بجے کے قریب روزہ کھول دیا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اوکھلا کی چوپال کے قریب والے مکان میں باہر کرسی بچھا کر بیٹھ گئے، سامنے میز پر ایک پیالی چائے گھر سے منگا کر رکھ لی اور اس کے علاوہ وہ کبھی پان نہیں کھاتے تھے مگر اس دن پان کھایا اور اخبار پڑھنے لگے۔ اب جامعہ نگر کے لوگ جب ان سے مسئلہ معلوم کرنے آتے تو فرماتے بھائی میں مفتی نہیں ہوں مگر میں نے روزہ کھول لیا ہے، آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ اس جواب پر ان کے خاص معتقد تو روزہ کھول دیتے اور جو محتاط طریقہ اختیار کرنا چاہتے وہ پھر بھی عمومی اعلان کا انتظار کرتے رہے اور پھر یہی ہوا کہ پھر شاید ۱۱ بجے تک دہلی شہر میں تصدیق حاصل ہونے کے بعد عمومی

اعلان کردیا گیا اور مولانا کے ذاتی فیصلہ کی تائید ہوگئی۔

**مولانا کی خطوط نویسی:** مولانا عام طور پر پوسٹ کارڈ کا استعمال فرماتے اور مختصر جملوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کر دیتے۔ اکتوبر ۷۲ء میں جب میں ایم اے کرنے کے لئے علی گڑھ گیا تو مولانا اس سے قبل ریٹائر ہوچکے تھے، اعظم گڑھ جاچکے تھے۔ اور میری زیادہ تر خط وکتابت علی گڑھ ہی سے رہی اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی عرض کردوں کہ ایم۔ اے کرنے کے لئے میرا علی گڑھ جانا بھی انہی کے مشورہ کے مطابق تھا۔

جب ۷۵ء میں ایم۔ اے فرسٹ ڈویزن کرنے کے بعد میں جامعہ آیا تو مدرسہ ابتدائی میں سابقہ ملازمت جوائن کرلی اور کام شروع کردیا اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال جامعہ ہائر سکینڈری میں رہنے کے بعد جامعہ کالج کے شعبۂ عربی میں لیکچرار کی جگہ خالی ہوئی تو میں نے درخواست دی اور مولانا (مرحوم) کو ایک بزرگ مشفق کی حیثیت سے لکھا کہ دعا فرمائیں اور ممکن ہو تو کسی ذمہ دار کو سفارشی خط لکھ دیں، ان کے جواب میں مرحوم نے جو چند جملے تحریر فرمائے وہ میرے لئے زندگی بھر ایک رہنما نصیحت نامہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے لکھا:

”بھائی بدر صاحب میں آپ کے لئے دعا گو ہوں اور کسی کو لکھ بھی دوں گا مگر اس زمانہ میں ایسے آدمی کی سفارش قبول کی جاتی ہے جس سے کسی منفعت کی امید یا دفع مصیبت مقصود ہو، ورنہ کون کس کی سنتا ہے؟ آج آپ روزمرہ کی زندگی میں غور کیجئے تو اس طرح کے مظاہر بخوبی دیکھنے کو مل جائیں گے“۔ بہرحال اس وقت مجھے وہ جگہ نہ مل سکی مگر اکتوبر ۷۸ء میں عارضی طور پر بحیثیت لیکچرار تقرر ہوگیا اور اس کی اطلاع جب مولانا کو کسی کے ذریعہ ملی تو ۳۰؍ اکتوبر ۷۸ء کو مجھے ان کا پوسٹ کارڈ کی شکل میں قابل قدر گرامی نامہ موصول ہوا، جو صرف میرے لئے نہیں اس مضمون کے ہر قاری کے لئے ہمیشہ ایک رہنما قندیل کی حیثیت سے روشنی عطا کرتا رہے گا، ملاحظہ ہو:

”دارالمصنفین، اعظم گڑھ

”مکرمی بدر صاحب، السلام علیکم!

”ایک صاحب سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ کالج کے شعبۂ عربی میں لیکچرر ہوگئے، اللہ تعالیٰ اسے باعثِ خیر وبرکت فرمائے اور مزید ترقیاں نصیب کرے۔

”پی۔ ایچ۔ ڈی تو آپ ہو ہی رہے ہیں، اب ذاتی طور پر عربی ادب کے مطالعہ میں وقت لگایئے۔ پابندی کے ساتھ ایک گھنٹہ اخبار ورسائل پر روزانہ صرف کیجئے اس سے روزمرہ کی رائج زبان سے واقفیت ہوتی رہے گی۔ اور ڈیڑھ گھنٹہ روز عربی ادب کی قدیم اہم کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیے۔ بظاہر یہ وقت کم معلوم ہوتا ہے لیکن پابندی سے سلسلہ جاری رہا تو ایک سال میں کافی کام ہوجائے گا۔ بولنے اور لکھنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ کرتے رہیے، اس کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ مطالعہ کے کسی حصہ کے صفحہ ڈیڑھ صفحہ کو دوسرے وقت اپنی زبان میں لکھ ڈالیے اور اس کو زبان سے دہرا بھی لیجئے، انشاء اللہ دو تین مہینے میں آپ نمایاں ترقی محسوس کریں گے“۔

☆☆☆

# حسنِ اخلاق

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی

حسنِ اخلاق ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔ سورۃ المومنون (آیات: ۱-۹) میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغو کاموں سے دور رہتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے رہتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کے ملک یمین میں ہوں کہ ان کے بارے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ ان کے علاوہ جو کچھ اور چاہیں تو وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، اور اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں''۔

ان آیات پر غور و فکر سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قرآن نے اہلِ ایمان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے والے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان میں عبادت کی ادائیگی کے ساتھ اپنے اعمال کا ذکر ہے جن کا تعلق بندوں کے حقوق کی ادائیگی یا اخلاق تقاضوں کی تکمیل سے ہے۔ مذکورہ آیات میں فلاح پانے والے اہلِ ایمان کے اوصاف میں نماز میں خشوع کی پابندی کے علاوہ لغویات سے اجتناب، عزت و آبرو کی حفاظت، امانت داری اور عہد و پیمان کے ایفاء کا تذکرہ ہے۔ بلاشبہ وہ اوصاف حسنہ ہیں جن کا تعلق اخلاقیات کی تکمیل اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی ہے اور یہ لوگوں کے لیے موجبِ راحت بنتے ہیں اور معاشرتی زندگی کو خوش گوار بناتے ہیں۔ اس آیت کے حوالے سے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے یہ تبصرہ فرمایا ہے: ''ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے، لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جو کوئی دوسرا نہیں جانتا اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لیے ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنہ کو قرار دیا گیا ہے''، (سیرۃ النبی ﷺ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳، ۶/۱۲)۔

اسی طرح نرم روی، نرم گفتاری و نرم مزاجی بھی اخلاقِ حسنہ کے مظاہر ہیں، اللہ رب العزت ان سے آراستہ ہونے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخر میں اللہ کے محبوب بندوں کے ۱۸ اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ زمین پر چلتے ہیں تو نرم روی اختیار کرتے ہیں یعنی اکڑ کر نہیں چلتے اور تکبر کا مظاہرہ نہیں کرتے اور جب بدتہذیبوں سے ان کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ان سے الجھتے نہیں، بلکہ سلام کر کے ان سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجھلون قالوا سلاما (الفرقان: ۶۳/۲۵)۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اس آیت میں ''عباد الرحمٰن'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کی تشریح عام طور پر اللہ کے محبوب بندے سے کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اہل ایمان ہیں، اس لیے کہ ایمان سے مشرف ہوئے بغیر اللہ کے محبوب بندے ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نرم چال چلنا اور بدتمیزی کرنے والوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور غرور و تکبر سے دور رہتے ہوئے تواضع و انکساری کا رویہ اپنانا (جو اچھے اخلاق کے مظاہر ہیں اور اللہ کو محبوب ہیں)، ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام عبادات سے مقصود در اصل صفتِ تقویٰ و پرہیز گاری (وہ دلی کیفیت جو نیکیوں کی محرک بنتی ہے اور برائیوں سے دور رکھتی ہے)، کی آبیاری و مضبوطی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون (البقرہ:۲/۲۱)[اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تا کہ تم تقویٰ والے بن جاؤ]۔ اس صفت کے پروان چڑھنے کا ایک لازمی نتیجہ بہترین اخلاق سے آراستگی ہے۔ حقیقت یہ کہ جب ایک شخص کے دل میں اللہ پر ایمان راسخ ہو جاتا ہے، عظمتِ الٰہی و خشیت الٰہی کا نقش اس کے دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اللہ کی عبادت اور اس کی بندگی بجالانا اس کا معمول بن جاتا ہے اور اس کے بندوں کے ساتھ اچھا برتاؤ اور ان کی خیر خواہی و ہمدردی اس کا وطیرہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اخلاق کی اچھائی اور کردار کی بلندی ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔ قرآن میں ایک مقام پر اہلِ ایمان کو جنت کی طلب میں آگے بڑھنے یعنی اعمال صالحہ کے اکتساب کے لیے مسابقت کی دعوت دی گئی ہے اور اسی ضمن میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ جنت ان اہلِ ایمان کے لیے تیار کی گئی ہے جو تقویٰ کی صفت سے متصف ہیں اور جو خوش حالی و بدحالی ہر حال میں اپنا مال (محتاجوں پر) خرچ کرتے ہیں، غم و غصہ کی حالت میں اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں، یعنی انتقامی کاروائی سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہوئے عفو و در گذر سے کام لیتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: "سارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السمٰوٰت والارض اعدت للمتقین ینفقون فی السراء والضراء والکظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین" (آل عمران: ۳/۱۳۳-۱۳۴)[اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے لیے مسابقت کرو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی طرح ہے۔ یہ تقویٰ والوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو کشادگی و تنگی ہر حال میں (محتاجوں پر) مال خرچ کرتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے در گذر کرنے والے ہیں]۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ ایمان و تقویٰ کا ثمرہ ہے کہ ایک شخص محتاجوں کی اعانت، صبر و ضبط، اعلیٰ ظرفی اور در گذر و معاف کر دینے کا خوگر ہو جاتا ہے۔

قرآن میں ایک دوسرے مقام پر تقویٰ والے مومنین کو جنت میں نصیب ہونے والی نعمتوں کا ذکر ہے اور پھر ان کے ان اوصاف خاصہ کا تذکرہ ہے جن کی وجہ سے وہ ان نعمتوں کے مستحق ہوں گے۔ ارشادِ الٰہی ہے: "ان المتقین فی جنت وعیون آخذین ما آتھم ربھم انھم کانوا قبل ذالك محسنین کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون وبالاسحار ھم یستغفرون وفی اموالھم حق للسائل والمحروم" (الذاریات:۵۱/۱۵-۱۹) [بے شک متقی لوگ اس روز باغوں وچشموں میں ہوں گے، جو کچھ ان کا رب انھیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے۔ وہ اس سے پہلے احسان کرنے والے یا نیکوکار تھے، راتوں کو کم ہی سوتے تھے اور رات کے پچھلے پہروں میں مغفرت طلب کرتے تھے اور (یہ سمجھتے تھے کہ) ان کے اموال میں محتاج ومحروم کا حق ہے]۔ اس آیت میں دنیوی زندگی میں اہل تقویٰ کے چار اوصاف (احسان کا معاملہ کرنا، اللہ کی عبادت میں رات کی نیند کو قربان کرنا، آخرِ شب میں توبہ واستغفار کرنا اور یہ تصور یا یقین رکھنا کہ ان کے مال میں محتاج وغریب بھی اپنا حق رکھتے ہیں) بیان کیے گئے ہیں جو انہیں جنت کی لازوال نعمتوں کا مستحق بنائیں گے۔ بلاشبہ جو شخص اپنے مال میں ضرورت مندوں کا حق تسلیم کرے گا وہ ان پر مال خرچ کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ احسان یا محتاجوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا حسنِ اخلاق کا ایک اعلیٰ مظہر ہے اور غرباء ومساکین پر اپنا مال خرچ کرنا بندگانِ خدا سے محبت اور کردار کی بلندی کی علامت ہے۔

مزید براں قرآن کریم سے یہ حقیقت بھی واشگاف ہوتی ہے کہ ایمان کے اعلیٰ مدارج نصیب ہونے اور نیکی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جانے کے بعد اہلِ ایمان سے جن اعمال کا صدور ہوتا ہے اس میں اللہ کی عبادت کے ساتھ اخلاقی اوصاف کا مظاہرہ بھی شامل ہے۔ اس آیت سے یہی نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے: "لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملئکۃ والکتاب والنبیین وآتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتٰمیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوۃ وآتی الزکوۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصبرین فی الباساء والضراء وحین البأس اولئك الذین صدقوا واولٰئك ھم المتقون" (البقرۃ:۲/۱۷۷) [نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی جانب کرلیے، بلکہ نیکی (کا اعلیٰ مقام) یہ ہے کہ انسان اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قایم کرے اور زکوۃ دے، اور نیک وہ لوگ بھی ہیں جب وہ عہد کریں تو اسے پورا کریں اور جو فقر وفاقہ، جسمانی تکالیف اور جنگ کی حالت میں صبر کریں۔ یہ ہیں [قول وعمل میں] سچے اور تقویٰ والے]۔

اس ضمن میں اس حدیث کا ذکر مناسب معلوم ہوتا

ہے، جس میں آپ ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی بیان کیا گیا ہے: احب عباد الله الی الله احسنهم خلقا (ماہنامہ راہِ اعتدال، فروری ۲۰۱۸ء ص ۴۴، بحوالہ: صحیح الجامع الصغیر/۱۷۷)[سب سے زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں]۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ نبی کریم ﷺ اکمل الایمان تھے یعنی ایمان کے اعلیٰ ترین مقام سے مشرف تھے۔ آپ ﷺ کے بارے میں قرآن کریم کی واضح شہادت یہ ہے: انك لعلیٰ خلق عظیم (القلم: ۶۸/۴)[بے شک آپ ﷺ اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر فائز ہیں]۔ اسی طرح قرآن میں آپ ﷺ کے اوصاف وکمالات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ ایسے شفیق ورقیق القلب ہیں کہ لوگوں کا پریشانی میں مبتلا ہونا یا کسی مصیبت سے دوچار ہونا بہت شاق گزرتا ہے، آپ ان کے لیے خیر کے مشتاق ہیں اور انتہائی مہربان ونرم دل ہیں (التوبہ: ۹/ ۱۲۸)۔ اسی ضمن میں قرآن کا یہ اعلان بھی پیشِ نظر رہے کہ اللہ رب العزت نے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا: وما ارسلنك الا رحمة للعلمین (الانبیاء: ۲۱/ ۱۰۷)[اور ہم نے آپ کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے]۔ ان آیات کی روشنی میں حضرت عائشہؓ کے ان الفاظ: کان خلق نبی الله القرآن [آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا] پر غور کیا جائے تو ان کی اہمیت ومعنویت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، یعنی آپ ﷺ قرآن کی اخلاقی تعلیمات کا کامل نمونہ تھے۔ قرآن کی نظر میں ایک مومن کے لیے جو اعلیٰ اخلاق وکردار مطلوب ہے نبی اکرم ﷺ کی سیرت پاک میں اسے مجسم دیکھا جا سکتا ہے۔ بلا شبہ نبی اکرم ﷺ کی اسی سیرتِ مبارکہ کا فیض تھا کہ آپ ﷺ کا وجود مبارک سب کے لیے باعث راحت ورافت بن گیا۔ مسلم وغیر مسلم، مخالف ومحبّ، اپنے وغیر سب آپ ﷺ کی خوش خلقی سے فیض یاب ہوتے اور سب آپ ﷺ کے قریب آکر راحت وسکون محسوس کرتے تھے۔ درحقیقت یہ ایمان کا ثمرہ ہے کہ اس سے مشرف ہونے والے آپس میں ایک دوسرے کے تئیں ہمدرد، رحم دل اور مددگار ہوتے ہیں۔ حضرت نعمان ابن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم لوگ اہل ایمان کو دیکھو گے کہ وہ ایک دوسرے پر رحم کرنے، دوستی رکھنے اور شفقت ومحبت کا مظاہرہ کرنے میں ایک جسم کے مانند ہیں، چنانچہ جب اس کے کسی حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارے جسم پر اس کا اثر پڑتا ہے اور سارے اعضاء جاگنے اور بخار میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبهائم)۔

مختصر یہ کہ اخلاق وکردار کی بلندی ایمان کا ثمرہ اور دین داری کا تقاضا ہے۔ جو شخص اخلاق کے اعتبار سے جتنا بہتر ہوگا وہ اسی اعتبار سے دین داری کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوگا۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ان من خیارکم احسنکم اخلاقا (صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی ﷺ)[تم میں وہ شخص بہتر ہے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے]۔ نامور عالم دین مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایک چشم کشا حدیث نقل کی ہے کہ نبی

کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”کسی کی نیکی کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اس کے روزہ نماز ہی کو نہ دیکھو، بلکہ یہ چیز دیکھو کہ جب وہ بات کرے تو سچ بولے اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس کو ٹھیک ادا کرے اور تکلیف ومصیبت کے دنوں میں بھی پرہیز گاری پر قایم رہے“ (اسلام کیا ہے؟، الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ، ۲۰۱۷ء ص۱۰۰)۔

حقیقت یہ کہ مذکورہ بالا آیات کریمہ و احادیثِ شریفہ سے یہ قیمتی سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے اور اس کی روشنی میں اصلاح احوال کی فکر کرنی چاہیے، خاص طور سے اپنے آپ کو اخلاقِ حسنہ سے مزین کرنا چاہیے۔ اللہ کرے ہم سب کو اس کی توفیق نصیب ہو۔ آمین ثم آمین۔

☆☆☆

ماضی کے دریچوں سے :

# 'غبارِ خاطر کا مقدمہ' کیا یہ مولانا آزاد کی تحریر ہے؟

محمد اجمل خاں

پیشکش : ڈاکٹر شائستہ خان

غبار خاطر مولانا آزاد کے احمد نگر جیل کے اندر صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام لکھے گئے خطوط (جو جون 1945 کے بعد غالباً اسی سال کتابی شکل میں شائع ہو گئے)، اس کا ابتدائیہ جسے ہم نے مقدمہ کا نام دیا ہے، اس مقدمہ کے ساتھ پھر دوبارہ یہ کتاب 1947 میں ایک بہتر سج دھج کے ساتھ لاہور سے شائع ہوئی؛ مزید بہتر دھج کے ساتھ یہ اس وقت شائع ہوئی جب ساہتیہ اکیڈمی نے ذاکر صاحب اور مالک رام صاحب کے مشترک عندیہ سے مولانا آزاد کی تصانیف کے لئے گویا ایک چیئر قائم ہوئی جس کے تحت مولانا آزاد کی کتابیں بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں۔ انھیں کتابوں میں غبار خاطر بھی تھی جسے مالک رام صاحب نے بڑے سلیقے سے مرتب کر کے مناسب حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اس مالک رام ایڈیشن کے بعد مولانا آزاد کے ادب دوستوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ غبار خاطر کا پرانا مقدمہ جس پر بطور مقدمہ نگار پروفیسر اجمل خاں کا نام ہے، اور جس کی جگہ مالک رام صاحب نے اپنا قائم مقام مقدمہ لکھا ہے، بہتر ہوتا کہ اجمل خاں کے نام والا پہلا مقدمہ تو رہتا ہی، مالک رام صاحب کی تحریر مقدمۂ ثانی کے طور سے شامل ہو جاتی۔

غبار خاطر کی ساہتیہ اکیڈمی کی ایڈیشن کی اشاعت پر یہ سوال اٹھانے والوں نے زیرِ لب کچھ اس شبہ کا بھی اظہار کیا کہ یہ اجمل خاں سے منسوب غبارِ خاطر کے پہلے ایڈیشن کا مقدمہ اس لئے بھی ڈراپ کیا جانا مناسب نہ ہوتا کہ قوی امکان ہے کہ یہ تحریر خود مولانا آزاد کی لکھی یا لکھوائی ہوئی ہو۔ اور اس لحاظ سے یہ تحریر واقعۃً زیادہ قیمتی ہو جاتی ہے۔ اور اب تو اس لئے بھی بہت قیمتی ہوگئی ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی کے قائم مقام ایڈیشن کے بعد پرانا مقدمہ تو بازار میں دستیابی کی حد تک تو بالکل ہی ناپید ہو گیا، پرانی لائبریریوں میں بھلے ہی مل جائے۔

تو اب غبارِ خاطر کے پہلے ایڈیشن کے مقدمہ کا مسئلہ چھڑتا ہے جو بظاہر پروفیسر اجمل خاں (مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری) کے نام سے ہے۔

تین صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ تمام و کمال پروفیسر اجمل خاں کا لکھا ہوا ہے؛ یا تمام و کمال مولانا آزاد کا املا

ہے؛ اور یا پھر، اجمل خاں نے لکھا ہے اور مولانا نے اس کو ترمیم و اضافہ کے بعد کتاب میں شامل کرایا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ الہلال (اور البلاغ) کے پہلے دور میں، جب سید سلیمان مولانا کے اسسٹنٹ کے طور سے اخبار کے ادارے میں شریک تھے تو ان کی بہت سی تحریریں مولانا آزاد کی تحریریں سمجھی جاتی تھیں، جنھیں بعد میں سید سلیمان ندوی نے دعویٰ کیا کہ فلاں فلاں تحریریں مولانا آزاد کی نہیں بلکہ ان کی لکھی ہوئی ہیں؛ یہ بھی صحیح ہے کہ تذکرہ کا مقدمہ جس پر مقدمہ نگار کی حیثیت سے فضل الدین احمد کا نام ہے (جو مولانا کے خسر تھے) اس پر بھی اس وقت، اور بعد میں بھی لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ یہ خود مولانا آزاد کا لکھا ہوا ہے (یا ان کا املا کرایا ہوا ہے)۔

اب یہ غبارِ خاطر کے مقدمہ کی بات چھڑی۔ الہلال کی تحریروں (مشہد اکبر وغیرہ) کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے جو دعوے کیے کہ یہ ان کی تحریریں ہیں، مولانا نے ان کے دعووں کو بظاہر تسلیم کر لیا یہ کہہ کر کہ اور جو کچھ تحریریں بھی وہ اپنی طرف منسوب کرنا چاہیں تو، خوش آمدید۔ فضل الدین احمد کے نام سے جو تحریر بطور مقدمہ تذکرہ چھپی اس کے بارے میں لوگوں کو اس لئے شبہ رہا کہ فضل الدین صاحب کے اس مقدمہ کے علاوہ کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے، اس لئے اس پر لوگوں کا شبہ گیا کہ مولانا نے ان کا نام، بعض نکات سے اپنی بچت کے لئے دے دیا ہے۔ لیکن اجمل خاں تو مشہور نہ سہی و معروف مصنف تو تھے، قرآنیات پر ان کی کتابیں اور گیتا پر نغمۂ خداوندی کے نام سے ان کے مبسوط مطالعہ سے سب لوگ واقف ہیں۔ تو پھر یہ غبارِ خاطر پر ان کے نام سے مقدمہ کیا نوعیت رکھے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ تذکرہ پر مولانا آزاد نے فضل الدین احمد کا نام دے کر، اور اس طرح اپنی بچت کر کے جو پہل کی تھی، امکان ہے کہ اجمل خاں کا نام دے کر غبارِ خاطر کے مقدمہ کی تصنیف کو اپنا قرار نہ دے کر شاید اس لئے بچت کا پہلو نکالا ہو کہ اب تو وہ قوم کے، اور پوری دنیا کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے بھی اکابر میں شمار ہوتے تھے۔ تو محض اس احتیاط کے پیش نظر کہ اس کتاب (غبارِ خاطر) میں کوئی ایسی ویسی بات در آئی ہو جو ان کی شہرت اور رتبہ کے منافی ہو، سو شہرت تو اب عالمگیر تھی اور رتبہ کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ کانڈین نیشنل کانگریس کے اتنی طویل مدت سے صدر تھے (گویا راشٹرپتی) جتنی مدت تک کانگریس کی تاریخ میں کوئی بھی اس کا سربراہ نہیں رہا؛ تو قدرتی طور سے احتیاط اور بچت کے پیش نظر اگر یہ مقدمہ انھوں نے املا کرا دیا ہو یا خود لکھ دیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اب کچھ آگے کی بات یہ آتی ہے کہ اس غبارِ خاطر کے اس مقدمہ کی کچھ اندرونی شہادتیں:

غبارِ خاطر کے پہلے ایڈیشن کا ابتدائیہ جسے مقدمہ کہہ سکتے ہیں، اصلاً کوئی سرخی نہیں ہے۔ یہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا، لیکن اندر لکھا ہے ''آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مولوی محمد احمد خاں پرنٹر پبلشر شائع ہوا۔ سال اشاعت کہیں نہیں دیا ہوا ہے، غلط نامہ شروع میں تین صفحہ میں ہے، جس کا عنوان ہے ''مطالعہ سے پہلے''۔

•

غبار خاطر کا پہلا ٹائٹل (پہلا ایڈیشن)، نقل مطابق اصل، اس طرح ہے :

مپرس تا چہ نوشتہ ست کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من ست ایں غبارِ خاطرِ ما

غبارِ خاطر
یعنی

مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض مکاتیب جو انہوں نے قلعۂ احمد نگر کی قید کے زمانے میں بعض احباب کے نام لکھے تھے۔ اور جو مکتوب الیہ کو ان کی رہائی کے بعد ملے۔ مولانا 9 اگست 1942 کو بمبئی میں گرفتار کر کے احمد نگر پہنچائے گئے، اور 15 جون 1945 کو رہا ہوئے۔

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

پھر اندر کا ٹائٹل آتا ہے، جس میں کتاب کے نام اور پبلشر کے نام کے بیچ میں یہ سطریں آتی ہیں:

"قلعۂ احمد نگر کی اسیری (از 9 اگست 1943ء تا 15 جون 1945ء) کے زمانے کی بعض تحریرات"

از ابوالکلام آزاد

•

غبار خاطر کے پہلے ایڈیشن کا ابتدائیہ، جسے مقدمہ کہہ سکتے ہیں، اصلاً اس پر کوئی سرخی نہیں ہے۔ یہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا، لیکن اندر لکھا ہے "آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مولوی محمد احمد خاں پرنٹر پبلشر شائع ہوا۔ سال اشاعت کہیں نہیں دیا ہوا ہے، غلط نامہ شروع میں تین صفحہ میں ہے جس کا عنوان ہے "مطالعہ سے پہلے"۔ (ش)

O

تاریخِ واقعاتِ شہاں نانوشتہ اند
افسانۂ کہ گفت نظیریؔ کتاب شد

اس مجموعے میں جس قدر مکتوبات ہیں وہ تمام تر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے تھے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی، اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی، اس لیے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔ ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو جب مولانا رہا ہوئے، تو ان مکاتیب کے مکتوبات الیہ تک پہنچنے کی راہ باز ہوئی۔

نواب صاحب سے حضرت مولانا کا دوستانہ علاقہ بہت قدیم ہے، مولانا نے خود ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پہلے پہل ان سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔ گویا ایک کم چالیس برس اس رشتۂ اخلاص و محبت پر گزر چکے، اور ایک قرن سے بھی زیادہ وقت کا امتداد اس کی تازگی اور شگفتگی کو افسردہ نہ کر سکا۔ دوستی و یگانگت کے ایسے ہی علائق

ہیں، جن کی نسبت کہا گیا تھا:

تزول جبال الراسیات وقلبھم
عن الحب لا یخلوا ولا یتزلزل

البتہ یہ علاقۂ محبت واخلاص صرف علمی اور ادبی ذوق کے رشتۂ اشتراک میں محدود ہے، سیاسی عقائد واعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سیاسی میدان میں مولانا کی دوسری راہ ہے، اور نواب صاحب اس سے رسم وراہ نہیں رکھتے۔

حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، مدبر بھی ہیں اور ساتھ ہی سیاسی جدو جہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے، اور علم اور ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے، پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان، عملی سیاست کی جدو جہد سے اتنا اور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اٹھ سکا ہے، مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے۔ گویا ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی ہیں: ع وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں!

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے علائق کا دائرہ کسی ایک گوشے ہی میں محدود نہیں ہے، علوم دینیہ کے حجروں کے زاویہ نشین، ادب وشعر کی محفلوں کے بزم طراز علم اور فلسفے کی کاوشوں کے دقیقہ سنج، اور میدانِ سیاست کے تدبر اور معرکہ آرائیوں کے شہ سوار، سب کے لیے ان کی شخصیت یکساں طور پر کشش رکھتی ہے، اور سب اس مجمع فضل وکمال کے افادات سے بقدرِ طلب وحوصلہ مستفید ہوتے رہتے ہیں:

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ زخویش برید ندو در تو پیوستند!

البتہ ان کے ارادت مندوں کا حلقہ جس قدر وسیع اور بین القومی ہے، اتنا ہی دوستوں کا دائرہ تنگ ہے:

کسے کہ زود گسل نیست، دیر پیوندست!

ایسے خوش قسمت اصحاب جنہیں مولانا اپنے ''دوستوں'' میں تصور کرتے ہوں خال خال ہیں، اور صرف وہی ہیں جن سے علم و ذوق کے اشتراک، اور رجحان طبیعت کی مناسبت نے انہیں وابستہ کر دیا ہے۔ ایسے ہی خال خال حضرات میں ایک شخصیت نواب صدر یار جنگ کی ہے۔

نواب صاحب مسلمانانِ ہند کے گزشتہ دورِ علم ومجالس کی یادگار ہیں۔ آج سے تیس چالیس برس پیشتر کا زمانہ، مولانا آزاد کی ابتدائی علمی زندگی کا زمانہ تھا۔ وہ اس وقت کے تمام اکابر وافاضل سے عمر میں بہت چھوٹے تھے یعنی ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت، اور محیر العقول علمی قابلیت کی وجہ سے سب کی نظروں میں محترم ہوگئے تھے، اور معاصرانہ اور دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ حکیم محمد اجمل خاں وغیرہم، سب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور علمی اور ادبی صحبتیں رہا

کرتی تھیں۔ اسی عہد کی صحبتوں میں نواب صدر یار جنگ سے بھی ان کی شناسائی ہوئی، اور پھر سناشائی نے عمر بھر کی دوستی کی نوعیت پیدا کر لی۔ مولانا اس رشتے کو خصوصیت کے ساتھ عزیز رکھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اس عہد کی یادگار ہے، جو بہت تیزی کے ساتھ گزر گیا، اور ملک کی مجلسیں قدیم صورتوں اور صحبتوں سے یک قلم خالی ہو گئیں۔

مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث ان کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں، لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ رکھا ہے۔ جن دوستوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ ہے، وہ ان کے علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں، اور اس طرح الگ رکھتے ہیں، گویا ان کی زندگی میں سیاسی افکار و اعمال کا کوئی گوشہ سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا۔ وہ اپنی سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی علمی زندگی پر پڑنے نہیں دیں گے۔ وہ جب کبھی ان دوستوں سے ملیں گے، یا خط و کتابت کریں گے، تو اس میں سیاسی افکار و اعمال کا کوئی ذکر نہ ہوگا۔ ایک بے خبر آدمی اگر اس وقت کی باتوں کو سنے، تو خیال کرے، کہ اس شخص کو سیاسی دنیا سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے، اور علم و ادب کے سوا اور کسی ذوق سے آشنا نہیں۔ ایک مرتبہ اس معاملے کا خود مولانا سے ذکر ہوا تو فرمانے لگے، جس شخص سے میرا تعلق جس حیثیت سے ہے، میں ہمیشہ اسے اسی حیثیت میں محصور اور محدود رکھنا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ دوسری حیثیتوں سے اسے آلودہ کروں، چنانچہ نہ تو کبھی وہ ان دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کے آلام و مصائب میں شریک ہوں، نہ کبھی اس کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار و اعمال سے اتفاق کریں۔ سیاسی معاملے میں وہ ہر شخص کو خود اس کی پسند اور خواہش پر چھوڑ دیتے ہیں، آپ ان سے کسی علمی، مذہبی اور ادبی تعلق سے برسوں ملتے رہیے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی سیاسی معاملات کا آپ سے ذکر نہیں کریں گے۔ ایسا معلوم ہوگا، جیسے اس عالم کی انہیں کوئی خبر ہی نہیں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سیاسی میدانوں کے طوفانی حوادث سے گھری ہوتی ہے، کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک دن یا ایک گھنٹے کے بعد کیا حوادث پیش آئیں گے۔ ممکن ہے کہ قید و بند کا مرحلہ پیش آجائے۔ بہت ممکن ہے کہ جلاوطنی، یا اس سے بھی زیادہ کوئی خطرناک صورت حال ہو۔ لیکن اچانک، عین اسی عالم میں کسی ہم ذوق دوست کی یاد ان کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے سارے گرد و پیش سے یک قلم کنارہ کش ہو کر اس کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں، اور اس استغراق اور انہماک کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں، گویا ان کی زندگی پر کسی خطرناک حادثے کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے، اور پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اپنے ذوق و کیف میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ اس وقت اپنی یکساں اور بے کیف سیاسی مشغولیت کا مزہ بدلنے کے لیے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیں گے، جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دور ہوگا۔ علم و فن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور و فکر کی کوئی کاوش، طبعیات کا کوئی نیا نظریہ تصوف و اشراق کا

کوئی وارد ہ، یا پھر ادب وانشا کی سخن طرازی اور شعر وسخن کی بزم آرائی، غرض کہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیائش کی جاسکے گی۔ اس وقت کوئی انہیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبانِ حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دہرا رہے ہیں:

کمند صید بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام است نے گورش!

مولانا اس صورتِ حال کو ''تحمیض'' سے تعبیر کیا کرتے ہیں، ''تحمیض'' عربی میں منہ کا مزہ بدلنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ "حمضو مجالسکم" یعنی اپنی مجلسوں کا مزہ بدلتے رہو۔ وہ کہتے ہیں، اگر گاہ گاہ میں اس تحمیض کا موقع نہ نکالتا رہوں تو میرا دماغ بے کیف اور خشک مشغولیتوں کے بارِ مسلسل سے تھک کر معطل ہو جائے۔ اس طرح کی ''تحمیض'' میرے لیے ذہنی عیش ونشاط کا سامان بہم کر دیا کرتی ہے، اور دماغ از سرِ نو تازہ دم ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سیاسی طوفانوں کے موسم میں کوئی ہم ذوق دوست آنکلتا ہے اور انہیں موقع مل جاتا ہے کہ قلم وتخئیل کی جگہ صحبت ومجالست کے ذریعہ اپنی مشغولیت کا ذائقہ بدلیں۔ وہ معاً اپنے گرد و پیش کی دنیا سے باہر نکل آئیں گے، اور ایک انقلابی تحول کے ساتھ اپنے آپ کو ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیں گے۔ وہ فوراً اپنے خادم خاص عبداللہ کو پکاریں گے کہ چائے لاؤ۔ یہ گویا اس کا اعلان ہوگا کہ ان کا خاص وقت آگیا۔ پھر شعر وسخن کی صحبت شروع ہو جائے گی، علم وادب کا مذاکرہ ہونے لگے گا، اور اعلیٰ درجہ کی چینی چائے ''وہائٹ جسامن'' کے چھوٹے چھوٹے فنجانوں کا دور چلنے لگے گا کہ:

حاصلِ کارگہِ کون ومکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست

انہیں اپنی طبیعت کے انفعالات پر غالب آنے، اور اپنے آپ کو اچانک بدل لینے کی جو غیر معمولی قدرت حاصل ہوئی ہے، وہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہیں خود اپنی آنکھوں سے اس انقلابی تحول کو دیکھنے کا موقع ملا ہو، مجھے آٹھ برس یہ موقع حاصل ہے۔

نواب صدر یار جنگ ایک خاندانی رئیس ہیں۔ ملک کے سیاسی معاملات میں ان کا طرز عمل وہی رہتا آیا ہے جو عموماً ملک کے طبقہ رؤسا کا ہے یعنی سیاسی کشمکش کے میدانوں سے علحدگی اور اپنے گوشۂ سکون وجمعیت خاطر پر قناعت۔ برخلاف اس کے مولانا کی پوری زندگی سیاسی جدو جہد کی جنگ آزمائی اور معرکہ آرائی کی زندگی ہے۔ لیکن صورتِ حال کا یہ اختلاف بلکہ تضاد ایک لمحے کے لیے بھی ان کے باہمی علائق کی یگانگت ویک جہتی پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ نہ کبھی مولانا سیاسی معاملات کی طرف کوئی اشارہ کریں گے، نہ کبھی نواب صاحب کی جانب سے کوئی ایسا تذکرہ درمیان آئے گا۔ دونوں کا علاقہ ذاتی محبت واخلاص اور ذوقِ علم وادب کے اشتراک کا علاقہ ہے۔ اور ہمیشہ اسی دائرے میں محدود رہتا ہے۔ چنانچہ قلعہ احمد نگر کے ایک مکتوب مؤرخہ ۲۹ اگست ۴۲ء میں وہ سیاسی حالات کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی ان معاملات کے لیے نہیں ہوا کرتی: ع از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

میری دکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے''۔

۱۵ جون ۴۵ء کو مولانا تین برس کی قید و بند کے بعد رہا ہوئے، لیکن رہائی کے بعد ہی انہیں فوراً شملہ پہنچنا، اور شملہ کانفرنس کی مشغولیتوں میں گم ہو جانا پڑا، اب وہ قلعۂ احمد نگر در بانکوڑا کے قید خانے کی جگہ وائسرائگل لاج شملہ کے مہمان تھے۔ لیکن یہاں بھی صبح چار بجے کی سحر خیزی اور خود مشغولی کی معمولات برابر جاری رہیں۔ ایک دن صبح اچانک نواب صاحب کی یاد سامنے آجاتی ہے، اور وہ ایک شعر لکھ کر تین برس پیشتر کی خط و کتابت کا سلسلہ از سر نو تازہ کر دیتے ہیں، پھر تبدیل آب و ہوا کے لیے کشمیر جاتے ہیں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہو جاتے ہیں، یہ ہاؤس بوٹ نسیم باغ کے کنارے لگا دیا گیا تھا، اور مولانا کی صبحیں اسی کے ڈرائنگ روم میں بسر ہونے لگی تھیں، یہاں پھر خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور ۳ ستمبر ۴۵ء کو مولانا اپنے ایک مکتوب میں قلعہ احمد نگر کے حالات کی حکایت چھیڑ دیتے ہیں، اور ان مکاتیب کی نگارش کے اسباب و محرکات کی تفصیلات لکھتے ہیں جو اس مجموعے میں جمع کیے گئے ہیں۔ چونکہ رہائی کے بعد کے مکاتیب کا یہ حصہ بھی ان مکاتیب سے مربوط ہو گیا ہے، اس لیے مولانا سے اجازت لے کر میں نے انہیں بھی اس مجموعے کی ابتداء میں شامل کر دیا ہے۔ رہائی کے بعد کے یہ مکاتیب اس مجموعے کے لیے دیباچے کا کام دیں گے۔

مولانا کو سیکڑوں خطوط لکھنے اور لکھوانے پڑتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان کی نقول نہیں رکھی جا سکتیں۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اپنے خاص علمی اور ادبی مکاتیب کی نقول رکھنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی اور اس طرح سیکڑوں مکاتیب ضائع گئے۔

۴۰ء میں، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ جو خاص مکاتیب وہ دوستانِ خاص کو لکھا کرتے ہیں، ان کی نقول رکھنے کی مجھے اجازت ملے۔ چنانچہ مولانا نے اجازت دے دی، اور اب ایسا ہونے لگا کہ جب کبھی مولانا کوئی مکتوبِ خاص اپنے ذوق و کیف میں لکھتے، میں پہلے اس کی نقل کر لیتا، پھر ڈاک میں ڈالتا۔ نواب صاحب کے نام ۴۰ء اور ۴۲ء میں جس قدر خطوط لکھتے گئے، سب کی نقول میں نے رکھ لی تھیں اور میرے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد مولانا نے قلعۂ احمد نگر کے مکاتیب میرے حوالے کیے کہ حسب معمول ان کی نقول رکھ لوں، اور اصل نواب صاحب کی خدمت میں بہ یک دفعہ بھیج دوں۔ لیکن میں نے جب ان کا مطالعہ کیا تو خیال ہوا کہ ان تحریرات کا محض نج کے خطوط کی شکل میں رہنا اور شائع نہ ہونا، اردو ادب کی بہت بڑی محرومی اور اربابِ ذوق کی ناقابلِ تلافی حرمانی ہوگی۔ مولانا اس وقت شملہ میں تھے۔ میں نے بہ اصرار ان سے درخواست کی کہ ان

مکاتیب کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کے تمام اربابِ ذوق ونظر اس واقعہ کے شکر گزار ہوں گے کہ مولانا نے اشاعت کی اجازت دے دی، اور اس طرح میں اس قابل ہو گیا کہ یہ مجموعہ دیدہ ورانِ علم و ادب کی ضیافت ذوق کے لیے پیش کروں۔

۴۲ء میں گرفتاری سے پہلے مولانا لاہور گئے تھے، وہاں انفلوائزا کی شکایت لاحق ہوگئی تھی، اسی حالت میں کلکتے آئے اور صرف تین دن ٹھہر کر ۲۔ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کرنے کے لیے بمبئی روانہ ہوگئے۔ بمبئی جاتے ہوئے ریل میں انہوں نے ایک مکتوب نواب صاحب کے نام لکھ کر رکھ لیا تھا کہ بمبئی پہنچ کر مجھے دے دیں گے، میں حسب معمول اس کی نقل رکھ کر اصل ڈاک میں ڈال دوں گا۔ لیکن بمبئی پہنچنے کے بعد وہ اپنی مصروفیتوں میں غرق ہوگئے، اور مکتوب سفران کے اٹاچی کیس میں پڑا رہا گیا۔ یہاں تک کہ ۹ اگست کی صبح کو وہ گرفتار ہوگئے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اس خط کا ذکر آیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اسے بھی ابتداء میں شامل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ شامل کر دیا گیا ہے۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ مولانا کے اسلوب نگارش (اسٹائل) کی نسبت اپنے تأثرات کے اظہار کی جرأت کروں گا، لیکن جب اس ارادے کو عمل میں لانے کے لیے تیار ہوا، تو معلوم ہوا کہ خاموشی کے سوا چارۂ کار نہیں۔ کیوں کہ جتنا کچھ اور جیسا کچھ لکھنا چاہیے اس کی یہاں گنجائش نہیں، اور جس قدر لکھنے کی گنجائش ہے، وہ اظہارِ تأثرات کے لیے کافی نہیں، صرف اتنا اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ فرانسیسی ادبیات میں ادب کی جس نوعیت کو ''ادب اعلیٰ'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، اگر اردو ادب میں اس کی کوئی مثال ہمیں مل سکتی ہے تو وہ صرف مولانا کی ادبیات ہیں۔

مولانا نے اپنے اسلوب نگارش کے مختلف ڈھنگ رکھے ہیں، کیوں کہ ہر موضوع ایک خاص طرح کا اسلوب چاہتا ہے، اور اسی اسلوب میں اس کا رنگ ابھر سکتا ہے۔ دینی مباحث کے لیے جو اسلوب تحریر موزوں ہوگا، تاریخ کے لیے موزوں نہ ہوگا۔ تاریخی مباحث جس طرز کتابت کے متقاضی ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ ادبی نگارشات کے لیے بھی وہ موزوں ہو۔ عام حالت یہ ہے، کہ ہر شخص ایک خاص طرح کا اسلوب تحریر اختیار کر لیتا ہے، اور پھر جو لکھتا ہے، اسی رنگ میں لکھتا ہے، لیکن مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علم و ذوق کے تنوع کی طرح اپنا اسلوب تحریر بھی مختلف قسموں کا رکھا ہے۔ عام دینی اور علمی مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت نگاری کے لیے انہوں نے ایک دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے، اور خالص ادبی انشاپردازی کے لیے ان دونوں سے الگ طریق نگارش ہے۔ جس زمانے میں ''الہلال'' نکلا کرتا تھا، تو اس میں کبھی کبھی وہ خالص ادبی قسم کی چیزیں بھی لکھا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں انہوں نے ایک ایسا مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا تھا، جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کے سامنے موجود نہ تھی۔ اس اسلوب کے لیے اگر کوئی تعبیر اختیار کی جاسکتی ہے، تو وہ صرف شعر

منثور کی ہے۔ یعنی وہ نثر میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریر از سرتاپا شعر ہوتی تھی۔ صرف ایک چیز اس میں نہیں ہوتی تھی، یعنی وزن، اور اس لیے اسے نظم کی جگہ نثر کہنا پڑتا تھا۔

اس طرز تحریر کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی نثر کی شاعری کو شعراء کی نظم کی شاعری سے مخلوط و مربوط کر کے ترتیب دیتے تھے۔ اور یہ اختلاط اور ارتباط اس طرح وجود میں آتا تھا کہ اشعار صرف مطالب کی مناسبت ہی سے نہیں آتے، بلکہ بجائے خود مطالب کا ایک جزء بن جاتے تھے۔ ایسا جزء کہ اگر اسے الگ کر دیجئے تو خود نفس مطلب کا ایک ضروری اور لاینفک جزء الگ ہو جائے۔ اکثر حالتوں میں مطالب کا سلسلہ اس طرح پھیلتا تھا کہ پورا مضمون نثر کے چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں سے مرکب ہوتا، اور ہر پیراگراف کسی ایک شعر پر ختم ہوتا۔ یہ شعر، نثر کے مطلب سے ٹھیک اسی طرح جڑا اور بندھا ہوا ہوتا جس طرح ایک ترکیب بند کا ہر بند ٹیپ کے کسی شعر سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ شعر بند کا ایک ضروری جزء بن جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم اور ہر نوعیت کے سیکڑوں شعر پرا باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ جس شعر کی جس جگہ ضرورت ہوئی، فوراً اسے نکالا اور انگوٹھی کے نگینے کی طرح مضمون میں جڑ دیا!

عام علمی اور دینی مباحث کی تحریرات میں مولانا بہت کم اشعار لایا کرتے ہیں۔ صفحوں کے صفحے لکھ جائیں گے اور ایک شعر بھی نہیں آئے گا۔ لیکن اس خاص اسلوبِ تحریر میں وہ اس کثرت کے ساتھ اشعار سے کام لیتے ہیں کہ ہر دوسری تیسری سطر کے بعد ایک شعر ضرور آ جاتا ہے، اور مطلب کے حسن و دل آویزی کا ایک نیا پیکر نمایاں کر دیتا ہے۔

قلعہ احمد نگر کے اکثر مکاتیب اسی طرز تحریر میں لکھے گئے ہیں، انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے، اور جس مطلب کو ادا کیا ہے، اس طرح کیا ہے، کہ جدتِ فکر نقش آرائی کر رہی ہے، اور وسعت تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر و اور تجدید اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ قلم اور زبان کے ہر گوشے میں، وہ طرز عام سے اپنی روش الگ رکھیں گے اور الفاظ و تراکیب سے لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک، ہر بات میں تقلید عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک نظر آئیں گے۔ انہوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ پیش رو اور صاحب اسلوب رہے ہیں، کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلیں چنانچہ لوگ نثر میں اشعار لاتے ہیں، تو عموماً اس طرح لاتے ہیں کہ کسی جزئی مناسبت سے کوئی شعر یاد آ گیا اور کسی خاص محل میں درج کر دیا گیا، لیکن مولانا اس قسم کی تحریرات میں جو شعر درج کریں گے، اس کی مناسبت محض جزئی مناسبت نہ ہوگی، بلکہ مضمون کا ایک ٹکڑا بن جائے گی، گویا خاص اسی محل کے لیے شاعر نے یہ شعر کہا ہے، اور مطلب کا تقاضا پورا کرنے اور ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس طرز تحریر پر وہی شخص قادر ہو سکا ہے، جو کامل درجے کا شاعرانہ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ، اساتذہ کے بے شمار

اشعار بھی اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہو، اور مطالب کی ہر قسم اور ہر نوعیت کے لیے جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں، فوراً حافظہ سے نکال لے سکتا ہو، پھر ساتھ ہی اس کا ذوق بھی اس درجہ سلیم اور بے داغ ہو کہ صرف اعلیٰ درجے کے اشعار ہی حافظہ قبول کرے، اور حسن انتخاب کا معیار کسی حال میں بھی درجہ سے نہ گرے۔ اس اعتبار سے مولانا کے حافظے کا جو حال ہے، وہ ہم سب کو معلوم ہے، قدرت نے انہیں جو خصائص بخشے ہیں شاید ان سب میں حافظے کی نعمت لازوال سب سے بڑی نعمت ہے، عربی فارسی، اور اردو کے کتنے اشعار ان کے حافظے میں محفوظ ہوں گے، یہ کسی کو معلوم نہیں، غالباً خود انہیں بھی معلوم نہیں لیکن جوں ہی وہ قلم اٹھاتے ہیں اور مطالب کی مناسبتیں ابھرنے لگتی ہیں، معاً ان کے حافظے کے بند کواڑ کھلنے شروع ہوجاتے ہیں۔ اور پھر ایسا ان مکاتیب میں بھی ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے، بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے گئے ہیں، لیکن قدرت بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی ابھری چلی آتی ہے، اور کاوش فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے!

ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں، فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔

ان مکاتیب پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے زیادہ اہم چیز جو سامنے آتی ہے، وہ مولانا کا دماغی پس منظر (بیک گراؤنڈ) ہے۔ اسی پس منظر پر افکار و احساسات کی تمام جلوہ طرازیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے۔ ایک شخص ۹ اگست کی صبح کو بستر سے اٹھا، تو اچانک اسے معلوم ہوا کہ وہ گرفتار شدہ قیدی ہے، اور کسی لامعلوم مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ پھر ایک ایسی شدید فوجی نگرانی کے اندر، جس کی کوئی پچھلی مثال ہندستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں موجود نہیں، اسے قلعۂ احمد نگر کی ایک عمارت میں بند کر دیا جاتا ہے اور دنیا سے تمام علائق یک قلم منقطع ہوجاتے ہیں، وہ اس حادثہ کے چوبیس گھنٹے کے بعد دوسری صبح کو اٹھتا ہے، اور قلم اٹھا کر خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے، پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن حالات کی تحریک، خیالات میں جنبش پیدا کرتی رہتی ہے، اور جو کچھ دماغ میں ابھرتا ہے، بلا روک ٹوک قلم کے حوالے ہوجاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسے حوصلہ فرسا حالات میں ان کا دماغی پس منظر کیا تھا، اور وقت کے تمام مخالفانہ حالات کو کس نظر اور کس مقام سے دیکھ رہا تھا، یہی دماغی پس منظر ہے جس کی نوعیت سے ہر عظیم شخصیت کی عظمت کا اصلی مقام دنیا کے آگے نمایاں ہوتا ہے، یہی کسوٹی ہے جس پر ہر انسانی عظمت کسی جا سکتی ہے، اور یہی معیار ہے جو ہر انسان کی عظمت و پستی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

ان مکاتیب میں مولانا نے خود کوشش کی ہے کہ اپنا دماغی پس منظر دنیا کے آگے رکھ دیں، اور اسی لیے یہ غیر ضروری ہوگیا ہے کہ اس بارے میں بحث و نظر سے کام لیا جائے۔ میں صرف معاملے کے اس پہلو پر اہل نظر کو توجہ دلانا چاہتا ہوں خود کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

گزشتہ جولائی میں جونہی ان مکاتیب کی اشاعت کا اعلان ہوا، ملک کے ہر گوشے سے تقاضے ہونے لگے کہ ان

کے ترجمے کا بھی سروسامان ہونا چاہیے۔ کلکتہ، بمبئی، دہلی، الہ آباد، کانپور، اور پٹنہ کے پبلشروں کا تقاضا تھا کہ انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگالی، تامل وغیرہ زبانوں میں ان کے ترجمے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے یہ تمام درخواستیں مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں، لیکن انہوں نے ترجمے کی اجازت نہیں دی، انہوں نے فرمایا کہ چند مکاتیب کے سوا یہ تمام مکاتیب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی دوسری زبان میں صحتِ ذوق ومعیار کے ساتھ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کیا جائے گا تو اصل کی ساری خصوصیات مٹ جائیں گی، چنانچہ اس وقت تک ترجمے کی اجازت کسی فرم کو نہیں دی گئی ہے۔ مولانا نے جس خیال سے ترجمے کو روکا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے ہر صاحبِ نظر اتفاق کرے گا۔ یہ نثر میں شاعری ہے، اور شاعری ترجمے کی چیز نہیں ہوتی۔ البتہ دو چار مکتوب جو بعض فلسفیانہ اور تاریخی مباحث پر لکھے گئے ہیں، ترجمہ کیے جاسکتے ہیں، انہیں مستثنیٰ کر دینا چاہیے۔

یہ تمام مکاتیب ''صدیق مکرم'' کے خطاب سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ ''صدیق'' تشدید کے ساتھ ''صدّیق'' نہیں ہے، جیسا کہ بعض اشخاص پڑھنا چاہیں گے، بلکہ بغیر تشدید کے ہے، ''صداقہ'' عربی میں دوستی کو کہتے ہیں ''صَدِیق'' یعنی دوست۔

۱۱ اپریل ۴۳ء کے مکتاب کے آخر میں متمم بن نویرہ کے مرثیے کے اشعار نقل کیے گئے ہیں (ص ۲۸۳)۔ یہ مرثیہ اس نے اپنے بھائی مالک کی یاد میں لکھا تھا:

لقد لامنی عند القبور علی البکا
رفیقی لتذراف الدموع السوافك
فقال اتبکی کل قبر رأیتهٗ
لقبری ثوی بین اللوی فالدکادك
فقلت له ان الشجا یبعث الشجا
فدعنی، فهذا کله قبر مالك

ان اشعار کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے:

''میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اس نے مجھے ملامت کی، اس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ اس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے، تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا، بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کو تازہ کر دیا کرتا ہے، لہذا مجھے رونے دے، میرے لیے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں!''

''حکایت بے ستون وکوہ کن'' ایران کے قدیم آثار میں ایک اثر ''بے ستون'' کے نام سے مشہور ہے، اور داستان سراؤں نے اسے فرہادِ کوہ کن کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مگر در اصل یہ ''بے ستون'' نہیں ہے، ''بہ ستون'' (بہستان یا باغستاں) ہے۔ فارسی قدیم میں ''باغ'' خدایا دیوتا کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ مقام ''خداؤں کی جگہ'' ہے۔

☆☆☆

# تبصرہ

نام کتاب : سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب

مرتب : ڈاکٹر عطا عابدی

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ضخامت : ۳۰۴

سال اشاعت : ۲۰۱۸ء

مبصر : ڈاکٹر شائستہ خان

سویت یونین کے بکھراؤ کے بعد ڈاکٹر عطا عابدی کو ایک اچھا موضوع سوجھا انھوں نے ایک سوال نامہ اہل نظر کو ارسال کیا، جس میں منجملہ اور باتوں کے لکھا تھا کہ:
''اتنا بڑا حادثہ ہو جائے کہ ۷۴ سالہ نظام کے انہدام کی شکل میں سامنے آئے تو ادیب کو اس کے متعلق اخلاقی جرأت سے لکھنا چاہیے......اپنے مزعومات پر نظر ثانی کرنا چاہیے ...... اشتراکیت کے خاتمے کے بعد ترقی پسند تحریک اپنا معنوی جواز کھو بیٹھی ہے''۔

جن ادیبوں نے سوالنامے کا جواب دیا ان میں غلام ربانی تاباں، قمر رئیس، مظفر حنفی، قرۃ العین حیدر، کمال احمد صدیقی، اویس احمد دوراں، محمد حسن، محمود ہاشمی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام، راشد انور راشد، مجروح سلطان پوری، مخمور سعیدی، وارث ریاضی، عبداللطیف اعظمی وغیرہ شامل ہیں۔

غلام ربانی تاباں نے لکھا:

میرا یہ خیال ہے کہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں سوشلزم کی نہیں بلکہ تجربہ کی شکست ہوئی ہے۔ سوشلزم آج بھی ایسے خواب دیکھتا ہے، جہاں انسان کا استحصال ہوا ہے سوشلزم ضرور آئے گا۔ وہ سماج ضرور بنے گا۔ اس میں کتنا وقت لگے گا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ تجربے ناکام بھی ہوتے ہیں۔ ترقی پسندی ایک نظریہ کا نام ہے۔ ہمارا کمٹ منٹ انسان کے روشن مستقبل سے ہے، جو کل تھا اور آج بھی رہے گا۔

ترقی پسندی جامد نہیں ہے۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ ترقی پسندی کے لئے مارکسی یا کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن:

یہ فلسفہ مکمل طور پر غلط نہیں تھا اور نہ ہے، مگر اس کے بعض پہلو ناقص تھے اور ہیں۔ اس کو آج بھی چھان پھٹک کر اختیار کرنا چاہیے، اندھے تقلیدی انداز میں نہیں۔ اشتراکیت کے خاتمہ سے میرے نزدیک ترقی

پسند تحریک کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک نے صرف اتنی بات کہی تھی کہ ادب سے سماج کا رشتہ ہونا چاہیے۔ اس نے توہم پرستی اور اندھے اعتقادات کے مقابلے میں معقولیت، سائنسی نقطۂ نظر، روشن خیالی، انسان دوستی اور عالمی برادری کا تصور پیش کیا تھا۔ ہاں ایسے لوگ بھی تھے اور ہیں جن کے نزدیک ترقی پسند ادب محض زندانی سیاست کا آلہ کار رہا ہے : مثلاً سردار جعفری نے جو نقطہ نظر اپنی کتاب میں پیش کیا وہ میرے نزدیک میکانیکی تصور تھا اور ہے۔ اس میں نقطۂ نظر کے بجائے ہنگامی افادیت پر زور دیا گیا۔

انسان دوستی اور روشن خیالی کے تصور پر مبنی نظریہ حیات جو معاشرے کی بنیاد ہے، اس کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔ میرے نزدیک یہی صحیح ترقی پسندی بھی ہے۔

وہ لوگ جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے حمایتی یا حواری رہے اور روس کو اپنا ماڈل سمجھتے رہے ان کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا ہے۔ لیکن دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے دماغ سے سوچا تھا ان کو صدمہ نہیں ہے۔ میں نے ۶۵ء ہی سے یہ محسوس کیا کہ مارکسزم کا ایک رخ جو روس پیش کر رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس عرصہ میں ترقی پسند وغیر ترقی پسند دونوں کو یہ ترغیب دی گئی کہ اپنے طور پر نہ سوچیں۔ جو سکہ بند ترقی پسند تھے انہوں نے روس کی بات کو آنکھ بند کر کے صحیح کہا۔ اب ہمارے سامنے راستہ طے کرنے کا مسئلہ ہے۔ مارکسزم کے اندر کے ناکارہ حصے کو نکالنے اور نئی بات اپنانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

میں تو ابتدا سے ہی اس کے خلاف تھا۔ ترقی پسندوں کی لٹریری تھیوری گڑ بڑ تھی، انہوں نے جو نظریہ اخذ کیا وہ گڑ بڑ تھا۔ خصوصاً اردو میں اور بھی گڑ بڑ تھا۔ اردو میں ترقی پسندی مخصوص وقت کا تقاضا تھی۔ آزادی اور حریت وغیرہ کے سلسلے کا قدم اچھا تھا مگر ادبی جمالیات کا جو نظریہ اخذ کیا گیا وہ گڑ بڑ تھا۔

ڈاکٹر قمر رئیس:

میں یہ نہیں سمجھتا کہ سوویت یونین میں جو سوشلزم کا اسٹرکچر بنا، اس کی بنیاد میں جو خامیاں تھیں، اس کا تعلق سوشلسٹ نظریات سے ہے۔ اس کی کمزوریوں کا بنیادی سبب عمل درآمد کی غلطیاں اور کج اندیشیاں ہیں۔ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ سوشلسٹ نظریات اور نظام کے خلاف سامراجی طاقتیں منظم طور پر گذشتہ ستر سالوں سے کام کر رہی تھیں۔

اسٹالن کے دور میں جو معاشی اور تعلیمی ڈھانچہ وجود میں آیا اور پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کا جو غلط تصور دیا گیا وہ اس نظام کی کجی کا سبب بنا اور اس پر جو عمارت تعمیر ہوئی وہ وہاں کے عوام کو معاشی ترقی اور سماجی خوشحالی نہیں دے سکی جو دے سکتی تھی۔ نہ ہی وہاں کے ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے ضمیر اور اظہار کی آزادی دے سکی۔ حالانکہ میری دانست میں اس طرح کی جمہوری آزادیاں سوشلسٹ نظریات کے منافی نہیں۔

میری دانست میں ترقی پسند احساس وفکر کے لیے کمیونزم یا سوشلزم سے وابستگی ضروری نہیں۔ نہ ہی مارکسی فلسفے سے وفاداری ضروری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ہندستان اور تیسری

دنیا خصوصا ایشیا کے عوام اور ان کے مسائل کا تعلق ہے سوشلزم کا انقلابی فیصلہ آج بھی ان کے لیے بامعنی ہے۔ اشتراکی نظریات کالعدم یا ناکارہ نہیں ہوئے، آنے والے دور میں ان کی معنویت باقی ہے۔

اویس احمد دوراں:

آپ کا اشارہ جن حالات وواقعات کی طرف ہے وہ سابق سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے سابق سوشلسٹ ممالک کے ان اربابِ اقتدار کی غلطیوں اور سوائے زمانہ سی آئی اے کی مجرمانہ وسازشی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے جو اشتراکی فلسفہ کے بالکل منافی عمل کر رہے تھے۔ گورباچوف کا طرزِ عمل اشتراکی نظریہ کی سراسر نفی تھا۔ جیسے جیسے ان کا اقتدار مستحکم اور کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی گئی ویسے ویسے انہوں نے اشتراکیت کو فرسودہ اور غلط نظام حیات کہنا شروع کر کیا۔

وہاں کے حالات وواقعات نے جس حادثہ کو جنم دیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراکی فلسفہ غلط یا آؤٹ آف ڈیٹ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو تقریبا پون صدی تک سوویت یونین کو خوشحالی اور ہر محاذ پر استحکام سے ہمکنار نہیں کر پاتا۔ اشتراکی نظام سے پہلے کا روس ایک غریب اور مفلوک الحال ملک تھا۔ مگر ۱۹۱۷ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد آناً فاناً امریکہ کی ٹکر پر آ گیا حالانکہ نازی ہٹلر نے ۴۵-۱۹۴۴ء میں اس کو تقریباً مسمار کر ڈالا تھا۔ اگر بقول آپ کے اشتراکیت غلط فلسفہ ہے تو سوویت یونین پون صدی تک کس طرح امریکہ کے مقابلہ کا ملک بنا رہا؟ میں ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے آج بھی یہ سمجھتا اور کہتا ہوں کہ سوویت یونین میں جس اشتراکی فلسفہ کے تحت تعمیر حیات کی گئی تھی وہ سو فیصد صحیح تھا۔

اشتراکیت کا خاتمہ کس خطۂ ارض سے ہو گیا؟ کیا کوئی نظریہ کبھی ختم ہوتا ہے؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکی نظریہ کے تحت دنیا کے چند ملکوں سے کمیونسٹ پارٹی کی حکومتیں ختم ہو گئی ہیں۔ مگر وہاں سے نظریہ کہاں ختم ہوا ہے؟ آپ کو اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے ضرور معلوم ہوتا ہوگا کہ روس میں اب بھی کمیونسٹ پارٹی قائم ہے۔ اگرچہ گورباچوف اور یلتسن نے پارٹی کو عوام سے دور اور محض کاغذی قسم کی چیز بنا کر رکھ دیا تھا جس کے سبب یہ سب کچھ ہوا۔ روس میں اشتراکیت ایک قابل قبول وقابل عمل نظریہ کی حیثیت سے نہ صرف اب بھی باقی ہے بلکہ دنیا کے ہر ملک میں کم وبیش سرگرم و فعال ہے۔ تو پھر ترقی پسندی اپنا معنوی جواز کس طرح کھو بیٹھی؟ ترقی پسندی کے علمبردار اپنے نظریہ پر نظر ثانی کیوں کریں؟ وہ کسی دیگر نظریۂ حیات وادب کی طرف کیوں رجوع کریں؟ ترقی پسند ادیب اپنا رشتہ ترقی پسندی اور اشتراکی فلسفہ سے نہ صرف برقرار رکھے ہوئے ہیں بلکہ اب وہ پہلے سے زیادہ بیدار اور چوکنے ہو گئے ہیں۔ میں ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ ترقی پسندی اور اشتراکی فلسفہ کا بدل دنیا میں اب تک پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا غلط ہوگا۔

یہ مکتب فکر برقرار رہے گا اور اس کے زیر اثر ترقی پسند ادب کی تخلیق جاری رہے گی۔ سوویت یونین میں

سوشلسٹ انقلاب کے ساتھ جس ترقی پسند ادب نے جنم لیا تھا روس کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر بھی اس ترقی پسند ادب کی نفی ہرگز نہیں ہوگی جو ستر سالوں میں صورت پذیر ہوا ہے۔ مثال کے طور پر صرف میکسم گورکی کے ناول 'ماں' کو لیجئے۔ میری دانست میں اس ناول کی کبھی نفی نہیں ہوگی۔ یہ ایک لازوال ادبی شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ بھی سوویت ادیبوں نے حسین، لطیف اور ادبی سوز و گداز سے معمور شعر و ادب کی تخلیق کی ہے۔

اردو کے ترقی پسند ادیب سیاسی ادیب یا ادیب سیاستداں نہیں ہیں۔ انہوں نے ماسکو کے اشارہ پر کبھی ادب کی تخلیق نہیں کی۔ فیض احمد فیض نے جیسی خوبصورت اور تابناک شاعری کی ہے اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ سردار جعفری نے اگرچہ نعرہ بازی بھی کی ہے لیکن ان کی شاعری کا غالب حصہ فنی حسن و جمال کا آئینہ دار ہے۔ ان کی نعرہ بازی بھی بے وقت کی راگنی نہیں کہی جاسکتی۔ خفتگانِ خاک کو جگانے کے لیے لوریوں کی نہیں نعروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ رزم و پیکار کے میدان میں حدیث دلبراں نہیں سنائی جاتی۔ سردار جعفری کی نعرہ بازی مزدور طبقہ کا رزمیہ ہے، رجز نامہ ہے، اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ ترقی پسند ادب کی نفی کردی جائے تو اردو ادب میں میر و غالب و اقبال کے بعد باقی کیا رہ جائے گا؟

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی:

اب جب کہ اس کا سیاسی جواز بھی باقی نہیں رہا ہے، ترقی پسند حضرات کو (اگر ایسے کوئی حضرات موجود ہیں) اپنے مزعومات پر یقیناً نظر ثانی کرنی چاہیے۔ لیکن اگر ہم یہ اصرار کریں کہ اب وہ کسی اور سیاسی نظریے کی طرف رجوع کریں تو ہم بھی وہی غلطی کریں گے جو ترقی پسندوں نے کی تھی، یعنی انہوں نے سیاسی نظریے کو مذہب کا مقام دے کر اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ ہر شخص کو مذہب کی ضرورت ہے اور ہمارا مذہب سب سے سچا ہے۔ دراصل ادیب کو عقیدے سے زیادہ اعتقاد کی ضرورت ہے، یعنی اسے انسان پر اعتقاد ہونا چاہیے۔ اسے اس بات سے سروکار نہ ہونا چاہیے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔

ادب کو نظریے کی ضرورت نہیں۔ اگر نظریہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ادب کی اصلی ضرورت ادبیت ہے۔ یعنی اگر ہماری تحریر میں فن کا اظہار نہیں، تو نظریہ اس میں چاہے جتنا ہو وہ ادب نہیں کہلائے گی۔

اگر مغل بادشاہت مٹ چکی ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ نظیری اور عرفی اور فیضی اور ابوالفضل اور طالب آملی وغیرہ بھی مٹ گئے؟

ادب کے نام پر جس قسم کی بے ادبی، بددیانتی اور بے ایمانی کا دور دورہ گزشتہ پچاس برس سے ہمارے یہاں ہے اور علم کے نام پر جس قسم کی جہالت، گروپ بندی، نااہلی اور صلاحیت کشی ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں اور خاص کر اردو کے شعبوں میں ہے، اس کو ختم کرنے کے لیے ہم سب متحد ہو کر کوشش کریں۔ ملحوظ رہے کہ ان حرکات میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں شریک ہیں۔

مجروح سلطان پوری:

ترقی پسندی سے بہتر کوئی نقطۂ نظر انسانی فلاح کا

نہیں ہے۔ اگر کسی نظام زندگی میں ہر شخص کو اس کا بنیادی حق یعنی روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج ملے، سوسائٹی میں ہر انسان محض اخلاقاً نہیں بلکہ معاشی و اقتصادی طور پر بھی تقریباً مساوی ہو، تو یقیناً ہر وہ شخص اس کی تائید کرے گا جس میں ذرا سی بھی دردمندی ہوگی۔ اور یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہوگا جب طبقے یکسر معدوم ہو جائیں گے اور ذاتی ملکیت کا جھگڑا اس لیے نہ ہو کہ سرمایہ چند ہاتھوں میں سمٹنے لگے اور ملک چند خاندانوں کے رحم و کرم پر زندہ رہنے پر مجبور ہو۔

روس کا ۷۴ سالہ نظام کسی 'غلط فلسفے' پر نہیں بلکہ ایسی حکومت کے تحت قائم ہوا جو اس کے قیام پر شدت و عجلت کا شکار ہوگئی۔ یعنی فلسفہ نہیں بلکہ اس کے اطلاق کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا وہ سقیم تھا۔ جس کا علم ہم ہندستانیوں کو اب ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ بدل کے طور پر اب جو نظام قائم ہے یا ہو رہا ہے، اس میں طبقات کی لعنت کا وجود لازمی ہے۔ جبکہ ہزاروں سال کی انسانی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ طبقات کے ہوتے معاشی و معاشرتی انصاف کا مکمل وجود ممکن ہی نہیں ہے اور یہ کہتے ہوئے معاف کیا جاؤں کہ اسلام کی جمہوریت جس کی عمر ۷۴ سال کے بجائے کھینچ تان کر چالیس سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتی۔ اس کے زوال کے بعد بھی اسلامی فلسفہ ہدف ملامت نہیں بنا، اسے آج بھی درست تسلیم کیا جاتا ہے، اور کیا جائے گا۔ جب یوں ہے تو لوگ سوشلزم کے فلسفے کو مطعون کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ ترقی پسندی اور دانشوری کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسانی فلاح کا حصول صرف اشتراکیت کے ذریعے ممکن ہے۔ ابھی تو یہ صرف ۷۴ سال تک قائم رہ سکا، کوئی ایسا نظام جو اس کے علاوہ ہو، تاریخ آج تک تو پیش نہیں کر سکی جو اس کے لگ بھگ بھی قائم رہ سکا ہو۔

پھر عرض کروں گا کہ اشتراکیت کا نہیں اس طریقہ کار کا خاتمہ ہوا ہے جو سقیم تھا۔ ماسکو کے اشاروں پر جن لوگوں نے، بقول آپ کے، ادب پیدا کیا ہے وہ غلطی پر تھے۔ ہمیں صرف اپنی فکر و دانش، ذوق و وجدان کے اشارے پر فن کی تخلیق کرنی ہے۔ 'تخلیق پاروں' کی حیثیت ہر عہد میں یہی مقدر ہے کہ اچھا ادب خواہ وہ کسی غزنوی کے اشارے پر ہو یا کسی اتابک زنگی یا جلال الدین اکبر کے ایما پر ہو، زندہ رہے گا۔ خراب ادب خواہ حمد و نعت سے مملو کیوں نہ ہو زندہ نہیں رہے گا۔

**معین احسن جذبی:**

سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب کے سوالوں کے سلسلہ میں ایک حقیر سا مشورہ ہے۔ دنیا ایک انقلاب سے گزر رہی ہے۔ جب یہ عمل ختم ہو جائے اس وقت: ع دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا! اس قدر جلد نہ کوئی فیصلہ کیجیے اور نہ دوسروں کو فیصلہ کرنے پر مجبور کیجیے۔

**عبداللطیف اعظمی:**

اگرچہ میں اپنے آپ کو غیر جانبدار کہتا ہوں مگر کچھ کمیونسٹ اور ترقی پسند ایسے ہیں جو مجھے اپنا مخالف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ مجھے اپنے جلسوں میں کبھی نہیں بلاتے، مگر سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جدیدیت پسند اور افادی یا اسلامی ادب کے علمبردار بھی مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنے جلسوں میں بلائیں۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ راقم الحروف نہ تو کسی نظریاتی تحریک کا سو فیصدی حامی و موید ہے اور نہ کسی مخصوص گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ میں ایک گروپ سے ضرور تعلق رکھتا ہوں جو غیر مشروط طور پر اردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنا مطمح نظر سمجھے۔ مگر ظاہر ہے اردو کے ایسے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی تعداد بہت کم ہے اور وہ غیر منظم ہیں۔

میری رائے میں ترقی پسند ادب کے بنیادی نظریات اور اعلیٰ قدروں سے اردو ادب بے حد متاثر ہوا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی وجہ سے اس میں ایک ایسا مستحکم اور دیرپا انقلاب آیا کہ اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ میرے اپنے خیال کے مطابق یہ تحریک آزادی سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی، اس لئے سقوط ماسکو کی وجہ سے کسی اثر کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوویت یونین کے ۷۵ سالہ دور حکومت میں بہت سی قابل اعتراض باتیں ہوئیں، مگر اس کی دو تین اعتراض مجھے پسند تھے۔ پہلا یہ کہ اس کا اقتصادی نظام، اسلام کے اقتصادی نظام سے خاصہ قریب تھا۔ دونوں ہی غریبوں، مجبوروں اور ضرورتمندوں کے حامی اور مددگار اور ظلم و جور اور استحصال کے شدید مخالف ہیں، دوسری قابل تعریف اور قابل قدر خصوصیت یہ تھی کہ روس ہمارے ملک کا سچا اور بہی خواہ دوست تھا، اس کی بے ریا دوستی کی وجہ سے ہمارے ملک کو بڑا سہارا ملا، جسے بھلانا ممکن نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس کے وجود کی وجہ سے سامراجی اور فسطائی طاقتوں کو من مانی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے زوال سے کمزور ملکوں کا ایک قابل اعتبار سہارا جاتا رہا۔ اب امریکہ جیسے طاقتور ملک کو شتر بے مہار کی طرح اپنے نامبارک عزائم اور ناپاک مقاصد کے لئے کھلی چھوٹ مل گئی ہے، اور بے روک ٹوک جو چاہتا ہے، کر گزرتا ہے۔

ڈاکٹر راشد انور راشد:

بیشتر ادیبوں نے روس کے اشتراکی نظریات کو غلط قرار دیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے قول پر ایمان لانے کے دوران یہ سوال بار بار ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر واقعی ایک غلط فلسفے کی بنیاد پر خیالات و نظریات کی بلند و بالا عمارت قائم کی گئی تھی تو وہ تقریباً پون صدی تک آخر کیسے سلامت رہی۔ پون صدی کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سوویت یونین میں جس اشتراکی فلسفہ کے تحت تعمیر حیات کی گئی تھی، وہ بالکل صحیح تھی، ہاں یہ اور بات ہے کہ بعد میں خامیوں کی دیمکیں، خیالات و نظریات کی مستحکم دیواروں کو چاٹنے لگیں اور بالآخر نتیجے کے طور پر فکر و نظر کی عالیشان عمارت کی مسماری ہمارے سامنے آئی۔

☆☆☆

# مراسلہ

پروفیسر آصف نعیم

محترم تسلیم!

روزنامہ انقلاب کے ۲۲ ستمبر ۲۰۱۶ء کا کے شمارے کا ایک کلپنگ میرے سامنے آ گیا، جی چاہا فکرنو کے قارئین کے ساتھ اسے شیئر کروں، ملاحظہ ہو:

**ٹوٹ گئیں مذہب کی دیواریں: مسلمان آصف کا دل ہندو ارجن بھائی کے سینے میں!** مسلم نوجوان آصف کے دل کو احمد آباد کے اسپتال میں ایک ہندو (ارجن بھائی) کے جسم میں ٹرانسپلانٹ کیا گیا۔ گجرات میں اولین ہارٹ ٹرانسپلانٹ کے ساتھ یہ دل کو چھو لینے والا واقعہ رونما ہوا۔ کہتے ہیں کہ انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور اسی کا مظاہرہ گجرات میں ایک مسلم نوجوان کی حادثہ میں موت کے بعد کیا گیا جس کے دل کو اس کے اہل خانہ نے ایک ہندو لڑکے کی جان بچانے کے لئے عطیہ کر دیا۔ مسلم نوجوان کے دل نے ایک ہندو نوجوان کو نئی زندگی عطا کر دی۔

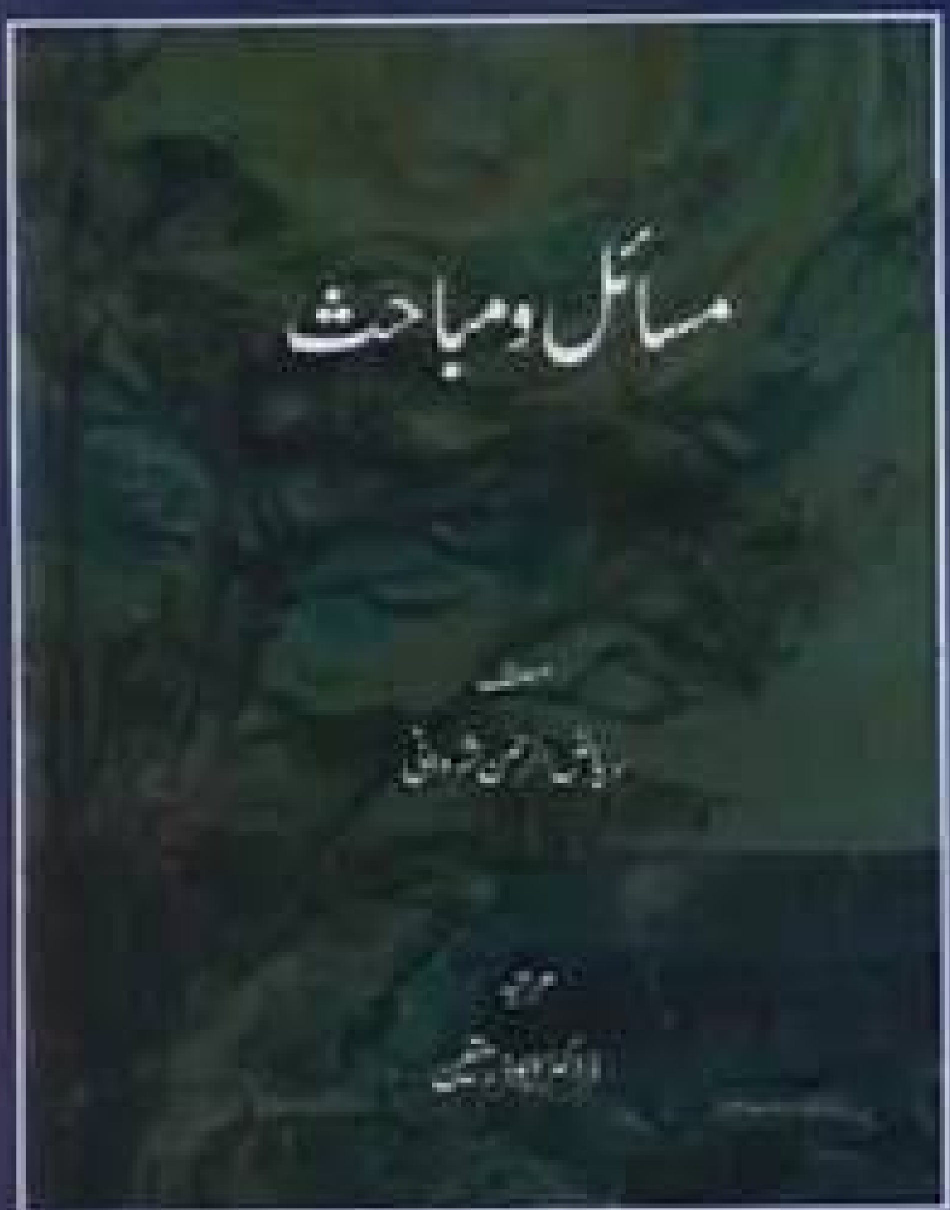
گجرات کے احمد آباد میں دو روز قبل اولین ہارٹ ٹرانسپلانٹ سرجری ہوئی جس کی وجہ سے بھاؤنگر کے ایک مسلم نوجوان کی موت کے بعد جام نگر کے ایک ہندو نوجوان کو زندگی مل گئی۔ اطلاع کے مطابق بھاؤنگر میں سڑک حادثہ میں جان گنوا چکے مسلم نوجوان آصف کے دل کو احمد آباد سیمس اسپتال لایا گیا۔ یہاں جام نگر کے کسان ارجن بھائی کے جسم میں آصف کے دل کو ٹرانسپلانٹ کیا گیا۔ بھاؤنگر کے شہور تحصیل کے سنوسرا گاؤں کے قریب چورڈلا میں رہنے والے آصف کھیت سے گھر واپس آ رہے تھے، تبھی راج کورٹ ہائی وے پر سڑک عبور کرتے وقت ایک گاڑی کی ٹکر سے زخمی ہو گئے۔ آصف کو فوری طور بھاؤنگر کی سرٹی اسپتال میں لایا گیا، جہاں پر ڈاکٹر نے انہیں مردہ قرار دے دیا۔ اس کے بعد آصف کے اہل خانہ نے آصف کے گردے اور دل کو عطیہ کرنے کا فیصلہ لیا۔ آصف کا دل جام نگر کے کسان ارجن بھائی کے جسم میں لگایا گیا اور ان کو نئی زندگی ملی۔ بھاؤنگر سے احمد آباد تقریبا ۱۷۶ کلومیٹر ہے۔ عام طور پر اتنی مسافت طے کرنے میں تین گھنٹے لگ جاتے ہیں، لیکن ٹرانسپلانٹ کرنے کے لئے آسف کا دل بھاؤنگر سے احمد لانے کے لئے ٹریفک پولیس کی مدد سے ۸۲ منٹ میں سیمس اسپتال لایا گیا۔ سیمس کے ڈاکٹر کی ٹیم بھاؤنگر گئی تھی تاکہ وہاں سے آصف کے جسم سے دل نکال کر محفوظ طریقے سے احمد آباد لایا جائے اور یہاں گزشتہ ۱۵ دنوں سے بھرتی جام نگر کے ارجن بھائی کے جسم میں آپریشن کر کے آصف کا دل لگایا تھا۔ بھاؤنگر ضلع میں چند تنظیموں نے دل اور جسم کے اہم اعضاء کو عطیہ کرنے کے لئے ایک مہم چلائی تھی، اس سے آصف کے اہل خانہ کو بھی تحریک ملی اور انہوں نے دل اور گردے کو عطیہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ (روزنامہ انقلاب، ۲۲/ ستمبر ۲۰۱۶ء)

☆☆☆

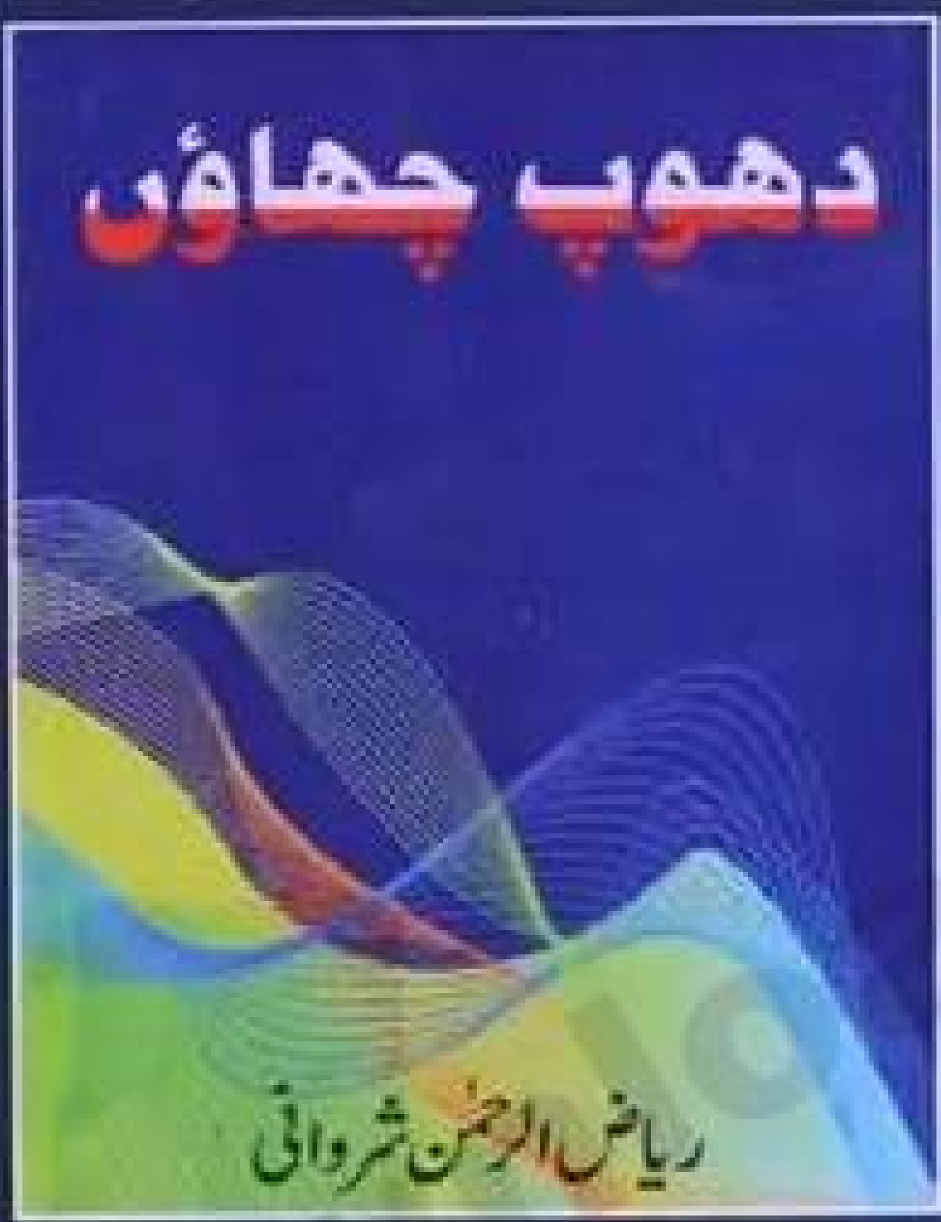
Monthly **FIKR-E-NAU** Aligarh

July 2019

## تصانیف پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی



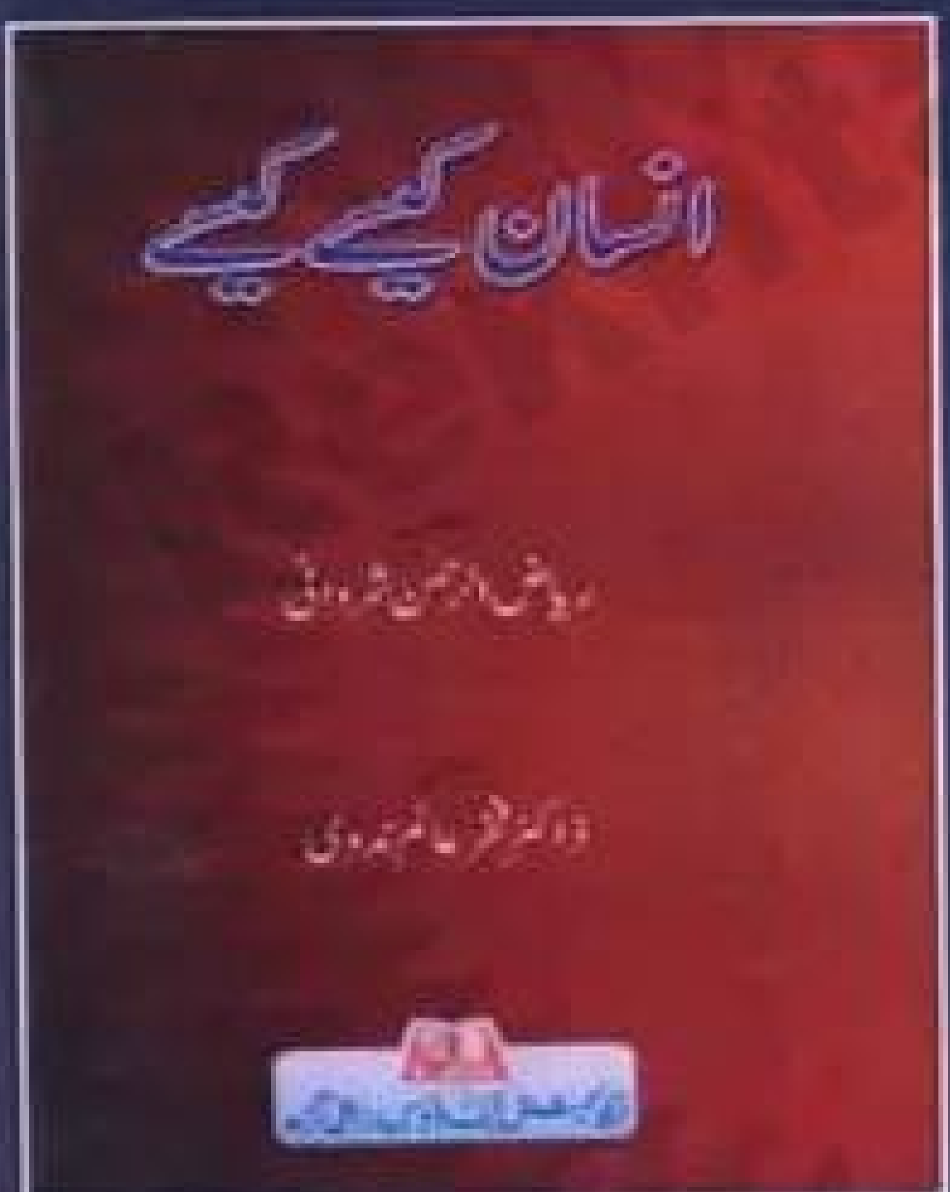

₹ 500/-



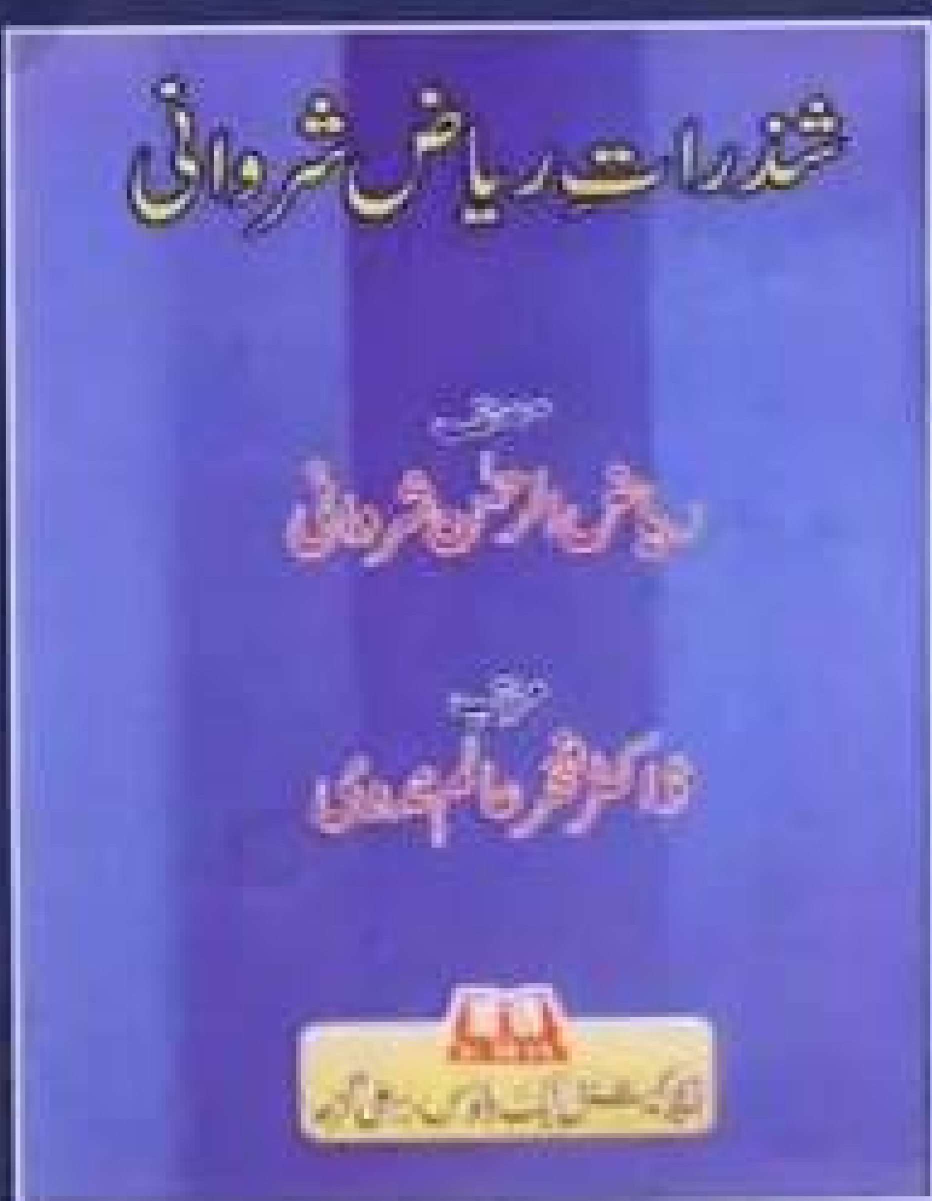

₹ 200/-



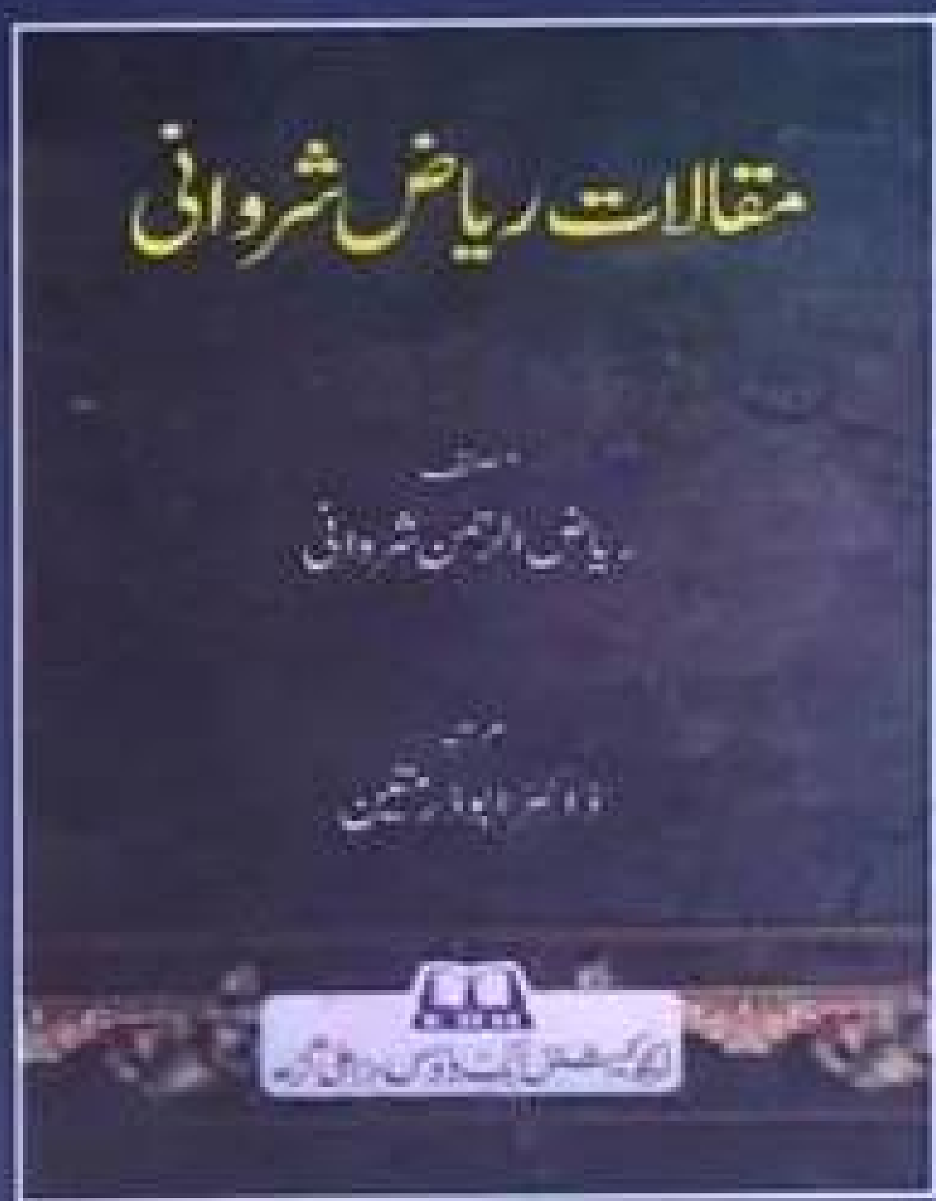

₹ 40/-




₹ 300/-




₹ 350/-




₹ 400/-

ملنے کا پتہ:

**BROWN BOOKS**

Opposite Blind School, Qila Road,
Shamshad Market, Aligarh-202001
Mob: +91-9818897975, Ph:0571 2700088
E-mail: bbpublication@gmail.com
Website: www.brownbooks.in